تفسیر
سورۃ الفاتحہ
The e-Book of Ahlesunnat Network
مصنف
علامہ سیّد شاہ تراب الحق قادری

اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا (ہے)

''سب خوبیاں اللہ کو جو مالک سارے جہان والوں کا،

بہت مہربان رحمت والا، روزِ جزا کا مالک،

ہم تجھی کو پوجیں اور تجھی سے مدد چاہیں، ہم کو سیدھا راستہ چلا،

راستہ اُن کا جن تو نے احسان کیا،

نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ بہکے ہوؤں کا''

(سُوْرَۃُ الْفَاتِحَہ، کَنْزُ الْاِیْمَان)

نحمدہٗ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

تعارف واسمائے سورہ فاتحہ:

سورہ فاتحہ مکہ میں نازل ہوئی۔ اس میں سات آیات ہیں۔ جمہور علماء کے نزدیک بسم اللہ سورہ فاتحہ کا جزو نہیں اس لیے اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ پر آیت ہے۔ جن علماء کے نزدیک بسم اللہ سورہ فاتحہ کی مستقل آیت ہے انکے نزدیک اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ پر آیت نہیں۔

(تفسیر قرطبی، جلد ا صفحہ ۹۴)

قرآن کریم کی تلاوت سے پہلے تعوذ یعنی اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم پڑھنا سنت ہے جبکہ ہر جائز کام سے قبل بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا خیر و برکت کا باعث ہے۔ وضو سے پہلے اور نماز کی ہر رکعت میں سورہ فاتحہ سے قبل بسم اللہ پڑھنا سنت ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شے جس قدر جامع صفات وکمالات ہوگی اسکے اسی قدر زیادہ نام وجود میں آئیں گے۔ مفسرین کرام نے اس سورت کے ۲۷ نام بیان کیے ہیں جن میں سے چند مشہور نام حسب ذیل ہیں:-

۱۔ الفاتحہ: رحمت و برکت اور علوم وحکمت کے دروازے کھولنے والی۔

۲۔ فاتحۃ الکتاب: کتابِ الٰہی، قرآنِ حکیم کے اسرار ومعارف کی چابی۔

۳۔ امُ القرآن: قرآن کریم کے مضامین کا خلاصہ اور ماخذ۔

۴۔ سبع مثانی: بار بار پڑھی جانے والی سات آیتیں۔

۵۔ سورۃ الحمد: اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور مناجات والی سورت۔

۶۔ سورۃ الکنز: فضائل و برکات اور اسرار و رموز کا خزانہ۔

۷۔ سورۃ الشفاء: تمام جسمانی و روحانی امراض کی دوا۔

فضائلِ سورہ فاتحہ:

☆ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا، کیا میں تمہیں قرآن کی سب سے عظیم سورت نہ بتادوں؟ وہ یہ ہے، الحمد للہ رب العالمین یعنی سورہ فاتحہ۔ یہی سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا ہوئی۔ (بخاری ج ۲ ص ۶۶۹، ابوداؤد ج ۱ ص ۲۰۵)

☆ رسولِ معظم ﷺ کا ارشاد ہے، کیا میں تمہیں قرآن کی سب سے افضل سورت نہ بتادوں؟ وہ یہ ہے، الحمد للہ رب العالمین یعنی سورہ فاتحہ۔

(مستدرک للحاکم ج ۱ ص ۵۶۰، الترغیب والترہیب ج ۲ ص ۶۱۶)

☆ محبوبِ کبریا ﷺ نے فرمایا، سورہ فاتحہ خزانہ عرش کے نیچے سے نازل ہوئی ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۱ ص ۱۷۸)

☆ ارشاد نبوی ہے، سورہ فاتحہ ہر مرض کے لیے شفا ہے۔ (مشکوٰۃ باب فضائل القرآن)

☆ حدیث شریف میں ہے، جس نے کسی گھر میں سورہ فاتحہ اور آیت الکرسی پڑھ لی تو اس گھر والوں کو اس دن کسی انسان یا جن کی نظر نہیں لگے گی۔ (کنز العمال ج ۱ ص ۱۴۰)

☆ بارگاہِ رسالت میں ایک فرشتہ نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! خوش ہو جائیے آپ کو دو ایسے نور عطا کیے گئے جو آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں ملے۔ ایک سورہ فاتحہ اور دوسرا سورہ بقرہ کی آخری آیتیں۔ (مسلم ج ۱ ص ۲۷۱، نسائی ج ۱ ص ۱۴۵)

☆ صحابہ کرام بچھو کے کاٹے پر اور مرگی کے مریض پر سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کرتے تو مریض اسی وقت تندرست ہو جاتا۔ (بخاری ج ۲ ص ۷۴۹، مسلم ج ۱ ص ۲۲۴)

☆ حضور ﷺ کا ارشاد ہے، اگر تم بستر پر سونے سے قبل سورہ فاتحہ اور سورۃ الاخلاص پڑھ لیا کرو تو سوائے موت کے ہر شے سے محفوظ ہو جاؤ گے۔ (ابوداؤد ج ۲ ص ۱۲۹)

اُمُّ القرآن:

قرآن مجید کے مضامین تین اقسام پر مشتمل ہیں۔ علوم العقائد، علوم الاحکام اور علوم التذکیر۔

علوم العقائد کا تعلق انسانوں کے عقائد و نظریات کی اصلاح سے ہے، علوم الاحکام انسانوں کے اعمال کی اصلاح کے متعلق تفصیلات پر مشتمل علم ہے جبکہ نیک بندوں پر انعام و اکرام اور گمراہوں پر عذاب کے تذکروں پر مشتمل علوم کا عنوان علوم التذکیر ہے تاکہ عبرت و نصیحت اور رقتِ قلب کے ساتھ باطنی تطہیر ہوتی رہے۔ سورہ فاتحہ کے مضامین انہی تین اقسام کا خلاصہ اور اجمالی بیان ہیں۔

انسان کو کس نے تخلیق کیا اور کیوں تخلیق کیا؟ انسان کو کس طریقے سے زندگی گزارنی چاہیے؟ اس کی زندگی کا انجام کیا ہوگا؟ بنیادی نوعیت کے یہ تین سوالات ہیں جو ہر دور میں عقلِ انسانی کے لیے نہایت اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ عقیدہ توحید سمجھے بغیر پہلے سوال کا جواب حاصل نہیں ہو سکتا اور تصورِ رسالت جانے بغیر دوسرے سوال کا جواب ملنا ممکن نہیں جبکہ تیسرے سوال کا جواب جاننے کے لیے آخرت کا علم ضروری ہے۔

سورہ فاتحہ کی ابتدائی تین آیات میں مذکورہ تینوں بنیادی عقائد یعنی عقیدہ توحید، عقیدہ رسالت اور عقیدہ آخرت بیان ہوئے ہیں۔ چوتھی آیت میں عبادت و استعانت سے متعلقہ امور بیان ہوئے جبکہ پانچویں آیت میں نظامِ ہدایت پر عمل پیرا ہونے اور صراطِ مستقیم پر گامزن رہنے کی دعا ہے۔ آخری دو آیات میں صراطِ مستقیم کی علامت بیان ہوئی کہ یہ اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ بندوں کا راستہ ہے اور یہ تعلیم دی گئی کہ صالحین کے حال سے موافقت اور گمراہوں سے اجتناب ضروری ہے۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو قرآن حکیم کی تمام تعلیمات کی روح اور خلاصہ ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ:

ارشاد ہوا، "سب خوبیاں اللہ کو جو مالک سارے جہان والوں کا"۔

ہر کمال اور خوبی جس کا ظہور اختیار اور ارادہ سے ہو اسکی تعریف و ثناء کو حمد کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات اور خوبیاں مستقل بالذات ہیں جبکہ غیر اللہ میں کوئی خوبی و کمال ذاتی و مستقل نہیں ہو سکتا لہٰذا جس مخلوق میں جو بھی خوبی اور کمال پایا جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ پس جس طرح کسی مصنوع کی تعریف اسکے صانع کی تعریف ہوتی ہے اسی طرح کسی بھی مخلوق کی تعریف درحقیقت اسکے خالق کی تعریف ہے کیونکہ خالقِ کائنات اگر وہ مخلوق تخلیق نہ فرماتا تو اس مخلوق کے اوصاف و کمالات لوگوں پر کیسے ظاہر ہوتے، لہٰذا جو بھی کسی مخلوق کی تعریف کرتا ہے وہ درحقیقت خالقِ حقیقی ہی کی تعریف کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خود قرآن حکیم میں جابجا اپنے محبوب رسول ﷺ، صحابہ کرام، اولیاء عظام اور ایمان والوں کی خوبیاں بیان فرما کر انکی تعریف کی ہے، چند ارشادات ملاحظہ

فرمائیں۔

☆ ”بیشک تمہارے پاس تشریف لائے تم میں سے وہ رسول (ﷺ) جن پر تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہے، تمہاری بھلائی کے نہایت چاہنے والے، مسلمانوں پر کمال مہربان مہربان (یعنی رؤف اور رحیم)“۔(التوبۃ:۱۲۸)

☆ ”اے غیب کی خبریں بتانے والے! بیشک ہم نے تمہیں بھیجا حاضر و ناظر اور خوشخبری دیتا اور ڈر سناتا اور اللہ تعالیٰ کی طرف اسکے حکم سے بلاتا اور چمکا دینے والا آفتاب“۔

(الاحزاب:۴۵، کنزالایمان)

☆ ”انبیاء اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ، یہ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں“۔(النساء:۶۹)

☆ ”(اے محبوب ﷺ) بیشک ہم نے تمہیں بیشمار خوبیاں عطا فرمائیں“۔(الکوثر:۱)

یہ تمام تعریفیں درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی تعریفیں ہیں کہ جس نے نبی کریم ﷺ کو تمام خوبیاں اور کمالات عطا فرمائے اور انہیں مقامِ محبوبیت پر فائز کر کے اپنی ذات وصفات کا ایسا کامل مظہر بنا دیا کہ جو بھی آپ کے دامنِ کرم سے وابستہ ہوئے وہ سب صاحبِ کمال اور لائقِ تعریف بن گئے۔

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ :

رب کے معنی ہیں ”تربیت و پرورش کرنے والا“۔ کسی چیز کو اسکی فطری صلاحیت و استعداد کے مطابق آہستہ آہستہ درجۂ کمال تک پہنچا دینے کو تربیت کہتے ہیں۔ عقل وشعور کی روشنی میں غور وفکر کیا جائے تو یہ حقیقت آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ کوئی چیز بھی خود بخود عدم سے وجود میں نہیں آتی یعنی کوئی شے بھی بغیر بنانے والے کے وجود میں نہیں آسکتی لہٰذا کائنات کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ اسے ضرور کسی نے پیدا کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا،

”کیا وہ کسی اصل (یعنی نطفہ) سے نہ بنائے گئے یا وہی (خود کو) بنانے والے ہیں؟ یا آسمان اور زمین انہوں نے پیدا کیے؟ (ہرگز نہیں) بلکہ انہیں (اللہ کی خالقیت و قدرت کا) یقین نہیں“۔(الطور:۳۵،۳۶، کنزالایمان)

جب کسی مخلوق کا اپنے آپ کو خود ہی بنالینا محال و ناممکن ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اور وہی آسمان و زمین کا خالق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا خالق و مالک ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس پر ایمان لائیں اور اسی کی عبادت کریں۔ ارشاد ہوا،

”اے لوگو! اپنے رب کو پوجو جس نے تمہیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا، یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پرہیزگاری ملے، جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا تو اس سے کچھ پھل نکالے تمہارے کھانے کو، تو اللہ کے لیے جان بوجھ کر برابر والے نہ ٹھہراؤ“۔(البقرۃ:۲۱،۲۲، کنزالایمان)

ان آیات مبارکہ میں نہ صرف اللہ تعالیٰ کی شانِ خالقیت بیان ہوئی بلکہ اسکی شانِ ربوبیت کو واضح طور پر بیان کر کے دلیلِ توحید قرار دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ انسان اور ساری کائنات کا خالق و مالک ہے اور اس نے انسان کی پرورش اور نشوونما کے لیے بیشمار نعمتیں پیدا فرمائیں۔ جن مظاہرِ فطرت کو انسان اپنی ناسمجھی اور گمراہی کے باعث معبود بنا بیٹھا وہ تو خود اللہ تعالیٰ ہی کی مخلوق ہیں، مستحقِ عبادت تو صرف رب تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہوا، ”اے لوگو! اپنے اوپر اللہ کا احسان (اور نعمتیں) یاد کرو، کیا اللہ کے سوا اور بھی کوئی خالق ہے کہ آسمان اور زمین سے تمہیں روزی دے؟ اسکے سوا کوئی معبود نہیں تو تم کہاں اوندھے جاتے ہو“۔(فاطر:۳، کنزالایمان)

اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایمان انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ انسان کا ایک بیجان بوند سے وجود میں آنا، مقررہ مدت تک ماں کے پیٹ میں نشوونما پانا، دنیا میں مقررہ وقت گزار کر فوت ہو جانا، سورج کا ہر روز مقررہ سمت سے طلوع ہونا اور مقررہ سمت میں غروب ہونا، دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کا آنا، بادلوں کا برسنا اور کھیتیوں کا مخصوص موسموں میں پروان چڑھنا، سیاروں کا اپنے مداروں پر چلنا نیز حیاتِ انسانی کی بقا کے لیے ہوا، پانی اور خوراک کا عظیم الشان نظام یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی حکمت و قدرت کا منہ بولتا شاہکار ہے۔ اس حوالے سے چند آیات ملاحظہ فرمائیں۔

”تم فرماؤ، بھلا دیکھو تو اگر اللہ قیامت تک ہمیشہ دن رکھے تو اللہ کے سوا کون خدا ہے جو تمہیں رات لا دے جس میں آرام کرو تو کیا تمہیں سوجھتا نہیں (یعنی تم غور نہیں کرتے)؟، اور اس نے اپنی رحمت سے تمہارے لیے رات اور دن بنائے کہ رات میں آرام کرو اور دن میں اسکا فضل ڈھونڈو (یعنی رزق تلاش کرو) اور اسلیے کہ تم حق مانو“۔(القصص:۷۲،۷۳)

”تو بھلا بتاؤ تو جو (تم زمین میں) بوتے ہو کیا تم اسکی کھیتی بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں (یعنی کیا تم اسے اُگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں)، ہم چاہیں تو اس (فصل) کو پامال کر دیں پھر تم باتیں بناتے رہ جاؤ کہ ہم پر اچانک آفت آپڑی یا ہم بےنصیب رہے۔ تو بھلا بتاؤ تو وہ پانی جو پیتے ہو کیا تم نے اسے بادل سے اتارا یا ہم ہیں اتارنے والے، ہم چاہیں تو اسے کھاری (یا کڑوا) کر دیں (تاکہ تم پی نہ سکو) پھر تم کیوں شکر نہیں کرتے“۔(الواقعۃ:۶۳ تا ۷۰)

کائنات کا منظم، مربوط اور متوازن نظام ہر لحظہ یہ گواہی دے رہا ہے کہ یہ کائنات محض اتفاقی یا حادثاتی طور پر وجود میں نہیں آئی بلکہ اسے علیم وحکیم رب نے حکمت ودانائی کے

ساتھ تخلیق فرمایا ہے۔

ارشاد ہوا، ''اس نے ہر چیز پیدا کر کے ٹھیک اندازہ پر رکھی''۔(الفرقان:۲)

مزید فرمایا گیا، ''تو رحمٰن کے بنانے میں کیا فرق (یا نقص) دیکھتا ہے، تو نگاہ اٹھا کر دیکھ، تجھے کوئی رخنہ نظر آتا ہے؟ پھر دوبارہ نگاہ اٹھا، نظر تیری طرف پلٹ آئے گی تھکی ماندی''۔(الملک:۳،۴، کنزالایمان)

یعنی بار بار کی جستجو سے بھی تم کوئی خامی یا کمی نہیں پاسکو گے۔حق یہی ہے کہ جو کچھ جس طرح رب تعالیٰ نے بنایا، اس سے بہتر کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہم از خود پیدا نہیں ہوئے۔وہ اللہ تعالیٰ ہے جس نے ہمیں بے جان قطرہ سے وجود بخشا اور ماں کے پیٹ میں ہماری پرورش کی پھر ہمارے وجود کو پروان چڑھانے کے لیے کائنات میں بیشمار نعمتیں پیدا فرمائیں۔وہی ہمارا خالق و مالک ہے وہی رزق دیتا ہے، ساری بھلائی اسی کے دستِ قدرت میں ہے۔تمام تعریفوں کا حقدار وہی ہے اسلیے ہمیں چاہیے کہ اسکے احسانات مانیں اور اسی کو معبود جانیں۔

رب کے معنی پالنے والے کے بھی ہیں اور مالک کے بھی۔اللہ تعالیٰ سارے جہانوں کا مالکِ حقیقی ہے۔وہ ارشاد فرماتا ہے، ''اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے''۔(البقرۃ:۲۸۴)

حضور ﷺ مومنوں کے مالک ہیں:

اللہ تعالیٰ نے جس کسی کو بھی کسی چیز کا مالک بنایا وہ مجازی مالک ہے یعنی بندوں کا کسی شے کا مالک ہونا اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہے۔ان بندوں کا اور جو کچھ انکی ملکیت میں ہے سب کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔رب تعالیٰ نے اپنے خاص فضل و کرم سے اپنے محبوب رسول ﷺ کو مومنوں کا مالک بنایا ہے۔ارشاد ہوا،

''یہ نبی مسلمانوں کا انکی جان سے زیادہ مالک ہے''۔(الاحزاب:۶، کنزالایمان)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے آقا و مولیٰ ﷺ کو تمام ایمان والوں کا انکی جان سے زیادہ مالک فرمایا ہے گویا سب مومن آقا و مولیٰ ﷺ کے غلام ہیں۔غلامی کیسے کی جاتی ہے اس بارے میں ایک حکایت ملاحظہ کیجیے۔ایک بزرگ نے غلام خریدا اور اس سے پوچھا، کیا کھاؤ گے؟ وہ بولا، جو آپ کھلائیں گے۔پھر پوچھا، کیا پہنو گے؟ وہ بولا، غلام کی کیا مرضی! جو آپ کہیں گے وہ پہن لوں گا۔پھر پوچھا، کیا کام کرلو گے؟ وہ عرض گذار ہوا، میرے آقا! میں آپ کا غلام ہوں آپ جو بھی حکم دیں گے پورا کروں گا۔اب جو کچھ آپ کو پسند ہوگا وہ مجھے بھی پسند ہوگا اور جو آپ کو ناپسند ہوگا وہ مجھے بھی ناپسند ہوگا۔یہ سن کر وہ بزرگ رونے لگے اور فرمایا، لوگو! غلامی کا قرینہ اس غلام سے سیکھو جو اپنے مالک کا مقام اس قدر جانتا ہے کہ اگر ہم جان لیں اور اپنے مالک کی ایسی غلامی کریں تو ضرور اسکے محبوب بن جائیں۔

''دنیا اور دین کے تمام امور میں نبی کریم ﷺ کا حکم مسلمانوں پر نافذ، انکی اطاعت واجب اور انکے حکم کے مقابل نفس کی خواہش ترک کرنا واجب ہے''۔(خزائن العرفان)

ارشاد ہوا، ''جس نے رسول کا حکم مانا، بے شک اس نے اللہ کا حکم مانا''۔(النساء:۸۰) مزید فرمایا، ''اور اللہ و رسول کا حق زائد تھا کہ اسے راضی کرتے اگر ایمان رکھتے تھے''۔ (التوبۃ:۶۲)

پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کی اطاعت اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے اور دوسری آیت سے معلوم ہوا کہ آقا و مولیٰ ﷺ کو راضی کرنے میں ہی اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے، ''اور نہ کسی مسلمان مرد نہ کسی مسلمان عورت کو (یہ حق) پہنچتا ہے کہ جب اللہ اور رسول کچھ حکم فرمادیں تو انہیں اپنے معاملے کا کچھ اختیار رہے، اور جو حکم نہ مانے اللہ اور اسکے رسول کا، وہ بیشک صریح گمراہی میں بہکا''۔(الاحزاب:۳۶)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کا حکم آجانے کے بعد ایمان والوں کو اپنے کسی معاملے میں بھی کوئی اختیار باقی نہیں رہا خواہ وہ معاملہ دینی ہو یا دنیاوی، معاشی ہو یا سماجی، سیاسی ہو یا ثقافتی۔اب ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ ہمارے شب و روز اللہ تعالیٰ اور آقا و مولیٰ ﷺ کی مرضی کے مطابق بسر ہوں اور ہم غلاموں کی مرضی ان کی مرضی کے تابع ہو جائے۔

حضور ﷺ مالکِ شریعت ہیں:

اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے اختیار سے حضور ﷺ شریعت کے بھی مالک ہیں۔قرآن حکیم نے آپ کے اس خاص منصب کو یوں بیان فرمایا ہے، ''اور جو کچھ رسول تمہیں عطا فرمائیں وہ لو اور جس سے منع فرمائیں، باز رہو''۔(الحشر:۷، کنزالایمان)

اللہ تعالیٰ نے آقا و مولیٰ ﷺ کو یہ اختیار دیا کہ آپ جس پر جو چاہیں حرام فرمائیں اور جس کے لیے جو چاہیں حلال فرمائیں۔اس حوالے سے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رسالہ ''منیۃ اللبیب ان التشریع بید الحبیب'' تحریر فرما کر یہ ثابت کیا کہ سرکارِ دو عالم ﷺ ربُّ العالمین کے کرم اور عطا سے

مالک ومختار ہیں۔اس رسالہ سے چند احادیث پیشِ خدمت ہیں۔

☆ نبی کریم ﷺ نے جب حرم مکہ کی نباتات کی حرمت کے حوالے سے وہاں کی گھاس کاٹنے کی ممانعت فرمائی تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! اس حکم سے گھاس کو مستثنیٰ فرمادیں کیونکہ وہ ہمارے سناروں اور قبروں کے کام آتی ہے۔تو حضور ﷺ نے فرمایا، اچھا! ہم نے گھاس کو مستثنیٰ کر دیا۔(بخاری، مسلم)

امام شعرانی اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو یہ مقام نہ دیا ہوتا کہ آپ اپنی مرضی سے شریعت میں جو چاہیں مقرر فرمائیں تو حضور ہرگز اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز کو حرمت سے مستثنیٰ نہ فرماتے۔(میزان الشریعۃ الکبریٰ باب الوضو)

☆ ایک شخص نے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر عرض کی، میں اس شرط پر اسلام لاؤں گا کہ میں صرف دو نمازیں پڑھا کروں۔حضور ﷺ نے اسے قبول فرمالیا۔(مسند احمد)

☆ آقائے دوجہاں ﷺ نے حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی گواہی کو دو مردوں کے برابر قرار دیا۔(مصنف ابن ابی شیبہ، تاریخ بخاری، مسند ابو یعلیٰ)

☆ سونا پہننا مرد کو حرام ہے مگر حضور ﷺ نے حضرت براء رضی اللہ عنہ کو سونے کی انگوٹھی پہننے کی اجازت عطا فرمائی۔(بخاری، مسلم)

☆ ریشم پہننا مرد کو حرام ہے مگر حضور ﷺ نے عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کو خارش کے باعث ریشمی لباس پہننے کی اجازت دیدی۔(بخاری، مسلم)

☆ نوحہ حرام ہے مگر آپ نے حضرت امِ عطیہ رضی اللہ عنہا کو ایک خاندان کے لیے نوحہ کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔(صحیح مسلم)

☆ آپ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو حالتِ جنابت میں مسجد میں آنے کی اجازت دی۔(ترمذی)

☆ حضور ﷺ نے مکہ کی طرح مدینہ منورہ کو حرم بنادیا۔(بخاری، مسلم)

☆ ابو بردہ رضی اللہ عنہ نے عرض کی، میرے پاس ۶ ماہ کا بکری کا بچہ ہے جو سال والے سے اچھا ہے۔فرمایا، اسکی قربانی کرو اور تیرے بعد یہ کسی کے لیے جائز نہیں۔(بخاری، مسلم)

☆ ایک شخص نے روزہ توڑ دیا۔آپ نے فرمایا، غلام آزاد کرسکتا ہے؟ عرض کی نہیں۔فرمایا، دوماہ کے لگاتار روزے رکھ سکتا ہے؟ عرض کی نہیں۔فرمایا، ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلاسکتا ہے؟ عرض کی نہیں۔اتنے میں کھجوروں کا ٹوکرا خدمت میں پیش کیا گیا۔فرمایا، انہیں خیرات کردے۔عرض کی، مجھ سے زیادہ کوئی غریب نہیں۔حضور ﷺ مسکرائے اور فرمایا، جا اپنے گھر والوں کو کھلادے، یہی تیرا کفارہ ہوجائے گا۔(بخاری، مسلم)

☆ بارگاہِ نبوی میں عرض کی گئی، کیا حج ہر سال فرض ہے؟ فرمایا، ہر سال فرض نہیں اور اگر میں ہاں کہہ دوں تو حج ہر سال فرض ہوجائے۔(مسند احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

☆ حضور ﷺ نے فرمایا، اگر مجھے اپنی امت کے مشقت میں پڑنے کا خیال نہ ہوتا تو میں ان پر فرض کردیتا کہ ہر نماز کے وقت مسواک کیا کریں۔(صحاح ستہ)

☆ حضور ﷺ کا ارشاد ہے، اگر مجھے امت کی دشواری کا خیال نہ ہوتا تو میں انہیں حکم دیتا کہ عشاء آدھی رات کو پڑھیں۔(بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی)

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم:

الرحمٰن اور الرحیم دونوں مبالغے کے صیغے ہیں اور رحمت سے ماخوذ ہیں۔"رحمٰن" میں رحمت اور مہربانی کا معنی اس قدر کثرت کے ساتھ پایا جاتا ہے کہ اس سے بڑھ کر کسی مہربان کا تصور ہو ہی نہیں سکتا۔یہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاص ہے، اسکا اطلاق کسی اور پر جائز نہیں۔

الرحیم کے معنی بھی "رحمت والا" یا "بہت رحم فرمانے والا" ہیں۔اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب رسول ﷺ کی شانِ رحمت بتانے کے لیے "الرحیم" کی صفت بیان فرمائی ہے۔

ارشاد ہوا، "رسول مومنوں کے لیے رؤف و رحیم ہیں"۔(التوبۃ:۱۲۸)

اللہ تعالیٰ کی صفت رحمٰن تمام مخلوق پر رحمت و مہربانی کو ظاہر کرتی ہے جبکہ اسکی صفت "الرحیم" رحمت کے اس پہلو کو اجاگر کرتی ہے جو ایمان والوں کے لیے خاص ہے اور اس کا بخشش ومغفرت سے گہرا تعلق ہے۔

ارشاد ہوا، "بیشک اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا رحم والا ہے"۔(النساء:۱۶)

مزید فرمایا، "اور وہ مومنوں کے لیے رحیم ہے"۔(الاحزاب:۴۳)

رحمتِ حق تعالیٰ کے اس پہلو کے متعلق حدیث شریف میں ارشاد ہوا، "اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے نہ مانگے تو اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوجاتا ہے"۔(ترمذی)

گویا "الرحمٰن" اللہ تعالیٰ کی رحمت کا وہ پہلو ہے کہ جب اس سے مانگا جائے وہ عطا کرتا ہے اور بن مانگے بھی مخلوق پر اسکی مہربانیاں ہوتی رہتی ہیں جبکہ "الرحیم" اسکی رحمت کا وہ پہلو ہے کہ اس سے نہ مانگا جائے تو وہ ناراض ہوجاتا ہے۔

رب کریم کی رحمت و مہربانی کا اندازہ اس حدیث پاک سے لگایئے کہ ایک بار حضور ﷺ کے پاس کچھ قیدی آئے۔ان میں سے ایک قیدی عورت دوڑتی پھر رہی تھی جب وہ کسی بچے کو دیکھتی تو اسے اٹھا کر چھاتی سے لگالیتی اور دودھ پلانے لگتی۔نبی کریم ﷺ نے فرمایا، کیا تم یہ سوچ سکتے ہو کہ یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں پھینک دے؟ صحابہ کرام نے عرض کی، ہرگز نہیں۔آپ نے فرمایا، جتنی یہ عورت اپنے بچے پر مہربان ہے، اللہ تعالیٰ اس سے بیحد زیادہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔(بخاری، مسلم)

مخلوق پر رحمت:

مخلوق کو تین مراحل میں رحمت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اول: جب اسے تخلیق کیا جائے یعنی عدم سے وجود عطا کیا جائے۔ دوم: وجود میں لانے کے بعد اسکی نشوونما کی جائے اور اسے باقی رکھا جائے۔ سوم: جسمانی نشوونما کے ساتھ ساتھ اس کی روحانی نشوونما بھی کی جائے تاکہ وہ درجۂ کمال پر پہنچ جائے اور اپنے مقصدِ تخلیق کو پالے۔

ارشاد ہوا، ''بیشک آدمی پر ایک وقت وہ گزرا کہ کہیں اسکا نام بھی نہ تھا''۔ (الدھر:۱)

دوسری جگہ فرمایا، ''اے انسان! تجھے کس چیز نے اپنے کرم والے رب سے نافرمان کردیا جس نے تجھے پیدا کیا پھر تجھے اعضاء کے ساتھ ٹھیک بنایا پھر اعضائے جسمانی میں توازن پیدا کیا، تجھے جس صورت میں چاہا ترتیب دیا''۔ (الانفطار:۶-۸)

لے۔ اللہ تعالیٰ کی شانِ رحمانیت ان تینوں پہلوؤں پر محیط ہے۔

ارشاد ہوا، ''بیشک آدمی پر ایک وقت وہ گزرا کہ کہیں اسکا نام بھی نہ تھا''۔ (الدھر:۱)

دوسری جگہ فرمایا، ''اے انسان! تجھے کس چیز نے اپنے کرم والے رب سے نافرمان کردیا جس نے تجھے پیدا کیا پھر تجھے اعضاء کے ساتھ ٹھیک بنایا پھر اعضائے جسمانی میں توازن پیدا کیا، تجھے جس صورت میں چاہا ترتیب دیا''۔ (الانفطار:۶-۸)

ان آیات میں رب کریم نے پہلے مرحلے کی رحمت کا ذکر فرمایا کہ اس نے انسان کو پیدا کیا اور بہترین اعضائے جسمانی سے مزین کیا۔ پھر دوسرے مرحلے میں انسانی وجود کو پروان چڑھانے کے لیے اس کائنات میں بیشمار نعمتیں پیدا فرمائیں۔ آسمانوں اور زمین میں موجود تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی کا حصہ ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا، ''اللہ ہے جس نے تمہارے بس میں سمندر کردیا کہ اس میں اسکے حکم سے کشتیاں چلیں اور اسلیے کہ اسکا فضل تلاش کرو اور اسلیے کہ حق مانو۔ اور تمہارے لیے کام میں لگائے جو کچھ آسمانوں میں ہیں (سورج چاند ستارے) اور جو کچھ زمین میں (چوپائے درخت نہریں وغیرہ) اپنے حکم سے، بیشک اس میں نشانیاں ہیں سوچنے والوں کے لیے''۔ (الجاثیہ:۱۲،۱۳)

یہ کیسے ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی جسمانی ضروریات پورا کرنے کے اسباب تو پیدا فرمادے مگر انکی روحانی ضرورتوں اور انکے مقصدِ تخلیق کی تکمیل کے لیے کوئی اہتمام نہ فرمائے۔ رب کریم نے انسانوں کو مقصدِ حیات بتانے اور درجۂ کمال پر پہنچانے کے لیے انبیاء کرام کی صورت میں ہدایت وراہنمائی کا جامع نظام قائم فرمایا جو اس کی رحمت کی اعلیٰ واکمل ترین صورت ہے۔

رب تعالیٰ کا ارشاد ہے، ''اگر اللہ کا فضل اور اسکی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم نقصان والوں میں ہوجاتے''۔ (البقرۃ:۶۴)

دوسری جگہ فرمایا، ''بیشک اللہ کا بڑا احسان ہوا مسلمانوں پر کہ ان میں اُنہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اسکی آیتیں پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے اور وہ ضرور اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے''۔ (اٰل عمران:۱۶۴)

ایک مقام پر سرکارِ دوعالم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے سراپا رحمت فرمایا۔ ارشاد ہوا، ''اور (اے محبوب) ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کے لیے''۔ (الانبیاء:۱۰۷)

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ نبوت ورسالت، اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت اور صفتِ رحمانیت کی عظیم نشانی ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ بہت مہربان اور رحمت والا ہے اور یہ اسکی مہربانی اور رحمت ہی ہے کہ اس نے ہمیں اپنا پیارا حبیب عطا فرمایا۔ (اٰل عمران:۱۶۴) اور یہ بھی اس کی مہربانی اور رحمت کہ اس رسول کو مومنوں کے لیے رؤف ورحیم بنایا۔ (التوبہ:۱۲۸) اور یہ بھی اسکی مہربانی اور رحمت کہ اسے تمام جہانوں کے لیے رحمت بنایا۔ (الانبیاء:۱۰۷) اور یہ بھی اسکی مہربانی اور رحمت کہ گناہگاروں کو مغفرت کے لیے انکی بارگاہ میں حاضری کا حکم دیا۔ (النساء:۶۴) اور یہ بھی اسکی مہربانی اور رحمت کہ اپنے محبوب رسول ﷺ کے وسیلہ سے ہماری توبہ قبول فرماتا ہے۔ (النساء:۶۴)

وہی رب ہے جس نے تجھ کو ہمہ تن کرم بنایا
اور ہمیں بھیک مانگنے کو ترا آستاں بتایا
تجھے حمد ہے خدایا

عقیدہ نبوت ورسالت کا انکار، اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت اور شانِ رحمانیت کے انکار کے مترادف ہے کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی جسمانی ضروریات پوری کرنے کے لیے تو کائنات میں طرح طرح کی نعمتیں پیدا کی ہوں لیکن انکی روحانی ضروریات کے لیے کوئی انتظام نہ فرمایا ہو۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہوا، ''اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر نہ کی جیسی کرنی چاہیے تھی، جب بولے کہ اللہ نے کسی آدمی پر کچھ نہیں اتارا''۔ (الانعام:۹۲)

یعنی منکروں نے انبیاء کرام پر وحی نازل ہونے کا انکار کرکے اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت اور رحمت وقدرت کا انکار کردیا کیونکہ انسانوں کی ہدایت کے لیے انبیاء ورُسل کا آنا اللہ تعالیٰ کے نظامِ ربوبیت کے کامل ہونے کی اعظم ومستحکم دلیل ہے اور اس کا انکار گویا رب تعالیٰ کی صفاتِ ربوبیت ورحمت کا انکار ہے۔

وسیلۂ رسالت، ایمان باللہ کی بنیاد ہے:

اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسکی توحید اور اسکی صفات پر ایمان لانا اسی صورت میں معتبر ہے جبکہ وہ رسول کریم ﷺ کے وسیلہ سے لایا گیا ہو۔ ارشاد ہوا،

''(اے محبوب!) تم فرماؤ، وہ اللہ ہے وہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اسکی کوئی اولاد اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔ اور نہ اسکے جوڑ کا کوئی''۔ (سورۃ الاخلاص)

یہ سورت خالص عقیدۂ توحید پر مشتمل ہے لیکن رب تعالیٰ نے اپنی توحید کا اعلان بھی قُل کہہ کے اپنے محبوب رسول ﷺ کی زبان مبارک سے کروایا تا کہ لوگ جان لیں کہ وسیلۂ رسالت ایمان باللہ کی بنیاد ہے اور اللہ تعالیٰ کو وہی توحید پسند ہے جو رسول کے وسیلہ سے مانی جائے۔ وسیلۂ رسالت سے منہ موڑنے والوں کو تو قرآن منافق قرار دیتا ہے۔

''اور جب ان سے کہا جائے کہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب اور رسول کی طرف آؤ تو (اے محبوب) تم دیکھو گے کہ منافق تم سے منہ موڑ کر پھر جاتے ہیں''۔ (النساء:۶۱)

اس آیت کریمہ میں منافقوں کی علامت یہ بیان ہوئی کہ وہ قرآن کریم سے منہ نہیں موڑتے لیکن رسول کریم ﷺ سے منہ موڑ لیتے ہیں اسلیے وسیلۂ مصطفیٰ ﷺ کے بغیر ان کا ایمان نامقبول اور بیکار ہے کیونکہ ایسوں کا ایمان کا اقرار، ایمان نہیں بلکہ منافقت ہے۔

قرآن کریم میں ایک اور مقام پر ارشاد ہوا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے وفات سے قبل اپنے بیٹوں سے پوچھا تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا،

''ہم پوجیں گے اُسے جو خدا ہے آپ کا اور آپ کے آباء ابراہیم و اسماعیل و اسحاق کا، ایک خدا''۔ (البقرۃ:۱۳۳، کنز الایمان)

اللہ تعالیٰ کے نبی یہ جاننا چاہتے تھے کہ انکی اولاد توحیدِ باری تعالیٰ پر بلاواسطہ ایمان کا اظہار کرتی ہے یا واسطۂ رسالت سے۔ انکی تعلیم و تربیت کے مطابق انکے بیٹوں نے انبیاء کرام کے واسطے سے معرفتِ توحید کا ذکر کیا اور اسے رب تعالیٰ نے قرآن کریم میں بیان فرما کر قیامت تک کے مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ بنا دیا۔

مَالِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ:

انسان کی حقیقت پر غور کیجیے کہ اسے کیوں پیدا کیا گیا؟ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا، ''تو کیا یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں بیکار بنایا اور تمہیں ہماری طرف پھرنا نہیں''۔ (المؤمنون:۱۱۵)

یعنی انسان کی تخلیق کا یقیناً کوئی نہ کوئی مقصد ہے اور اس مقصد کا لازمی تقاضا ہے کہ انسان اس مقصد کا نتیجہ پانے کے لیے رب تعالیٰ کی بارگاہ میں لوٹ کر جائے۔ اس مقصدِ حیات کے بارے میں یوں راہنمائی فرمائی گئی، ''وہ (اللہ ہے) جس نے موت اور زندگی پیدا کی تا کہ تمہاری آزمائش ہو کہ تم میں کس کا کام زیادہ اچھا ہے''۔ (الملک:۲)

غور طلب بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تخلیق کیا، اسکی جسمانی و روحانی ضروریات کو پورا کیا، اسکی راہنمائی کے لیے رسول بھیجے جنہوں نے ہدایت و گمراہی کا فرق واضح کر دیا۔ پھر رب کریم نے انسان کو عقل و فہم کے ساتھ ساتھ ارادہ و عمل کی آزادی بھی عطا فرمائی تا کہ اسے آزمایا جائے کہ وہ نفس و شیطان کی غلامی کر کے گمراہی کو اپناتا ہے یا اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی بندگی و اطاعت کر کے اس امتحان میں کامیاب ہوتا ہے، تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان کی زندگی کا انجام بغیر سزا و جزا اور بغیر کسی نتیجہ کے ہو جائے۔

پس نظامِ توحید و رسالت کا تقاضا ہے کہ موت کے بعد ایک دن سب کا حساب کتاب ہو، نیکوں کو جزا اور بروں کو سزا ملے، یہی عقیدۂ آخرت ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسانوں کی تخلیق اور انکی ہدایت و راہنمائی کا سارا نظام بے مقصد و بیکار ہو جاتا۔

ارشاد ہوا، ''بیشک وہ جو ہمارے ملنے کی امید نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پسند کر بیٹھے اور اس پر مطمئن ہو گئے اور وہ جو ہماری آیتوں سے غفلت کرتے ہیں، ان لوگوں کا ٹھکانا دوزخ ہے، بدلہ ان کی کمائی کا''۔ (یونس:۷،۸)

ان آیات سے واضح ہو رہا ہے کہ جزا و سزا رب کریم کے عدل و نصاف کا تقاضا ہے۔ آج مسلمانوں کی دین سے دوری اور بداعمالیوں کا بڑا سبب یہی ہے کہ ان کا آخرت پر یقین کمزور ہو گیا ہے۔ قرآن حکیم بتاتا ہے کہ جن کا آخرت پر اور آخرت میں رب تعالیٰ سے ملنے پر یقین نہیں یا ان کا یقین کمزور ہے انکے لیے نمازوں کی پابندی کرنا مشکل اور دشوار ہے جبکہ پختہ یقین والوں کے لیے یہ ہرگز دشوار نہیں۔ ارشاد ہوا،

''اور بیشک نماز ضرور بھاری ہے مگر ان پر نہیں جو دل سے میری طرف جھکتے ہیں جنہیں یقین ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسکی طرف پھرنا''۔ (البقرۃ:۴۵،۴۶)

اب آپ خود فیصلہ کیجیے کہ اللہ تعالیٰ اور آخرت پر آپ کا ایمان کس درجہ میں ہے؟ نمازوں کی پابندی کرنا آپکے لیے دشوار ہوتا ہے یا آسان؟ خاص طور پر فجر اور عشاء کی نمازیں جنکے بارے میں آقائے دوجہاں ﷺ کا فرمان ہے، ''منافقوں پر فجر اور عشاء سے زیادہ کوئی نماز بھاری نہیں، اگر جانتے کہ ان نمازوں میں کیا ثواب ہے تو زمین پر گھسٹتے ہوئے بھی نماز کے لیے آتے''۔ (بخاری، مسلم)

دراصل اصلاحِ فکر و عمل کے اسلامی نظام میں فکرِ آخرت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ آخرت پر کامل ایمان ہی انفرادی اور اجتماعی فلاح کے حصول کا ضامن ہے۔ رب

کریم کا ارشاد ہے،'' اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہر جان دیکھے کہ کل کے لیے کیا آگے بھیجا، اور اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ کو تمہارے کاموں کی خبر ہے''۔ (الحشر:۱۸)
رسول کریم ﷺ کا یہ فرمان بھی مشعلِ راہ بنایئے۔ ارشاد ہوا،'' جو تمام غموں کو ایک آخرت کا غم بنالے، اللہ تعالیٰ اسے دنیا کے تمام غموں میں کافی ہوگا اور جسے دنیا کے غم ہر طرف لیے پھریں (اور اسے آخرت کی فکر نہ ہو)، تو اللہ تعالیٰ اس کی پرواہ بھی نہ کرے گا کہ وہ کون سے جنگل میں ہلاک ہوا''۔ (ابن ماجہ)

آخرت پر قرآنی دلائل:

موت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے پر قرآن کریم سے چند دلائل پیشِ خدمت ہیں:۔

☆ '' بیشک اللہ دانے اور گٹھلی کو چیرنے والا ہے، زندہ کو مردہ سے نکالنے والا اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا، یہ ہے اللہ! تو تم کہاں اوندھے جاتے ہو''۔ (الانعام:۹۵)

اللہ تعالیٰ جب اس بات پر قادر ہے کہ وہ جاندار انسان وحیوان کو بے جان نطفہ سے، جاندار سبزہ کو بے جان دانہ سے اور جاندار پرندے کو بے جان انڈے سے اور اسکے بالکل برعکس انہی بے جان چیزوں کو مذکورہ جاندار چیزوں سے نکالے تو وہ مردوں کو زندہ کیوں نہیں کرسکتا؟ یقیناً وہ مردوں کو زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔

☆ '' اور وہی ہے جو رات کو تمہاری روحیں قبض کرتا ہے (تو تم پر نیند مسلط ہوجاتی ہے اور تمہارے تصرفات اپنے حال پر باقی نہیں رہتے)، اور جانتا ہے جو کچھ تم دن میں کماؤ پھر تمہیں دن میں اٹھاتا ہے کہ ٹھہرائی ہوئی میعاد (یعنی مقررہ عمر) پوری ہو، پھر تمہیں اسی کی طرف پھرنا ہے پھر وہ بتادے گا جو کچھ تم کرتے تھے''۔ (الانعام:۶۰)

یہ آیت بھی مرنے کے بعد زندہ ہونے پر دلیل ہے۔ جس طرح روزانہ سوتے وقت تم پر ایک طرح کی موت وارد کی جاتی ہے جس سے تمہارے حواس معطل ہوجاتے ہیں اور چلنا پھرنا پکڑنا اور بیداری کے دیگر افعال سب معطل ہوجاتے ہیں اسکے بعد پھر بیداری کے وقت اللہ تعالیٰ تمام قویٰ کو انکے تصرفات عطا فرماتا ہے یہ دلیل واضح ہے اس بات کی کہ وہ زندگی کے تصرفات بعد موت عطا کرنے پر اسی طرح قادر ہے۔ (خزائن العرفان)

☆ '' اور وہی (اللہ) ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے اسکی رحمت کے آگے مژدہ سناتی ہیں، یہانتک کہ جب اٹھالائیں بھاری بادل، ہم نے اسے کسی مردہ شہر کی طرف (جہاں خشک سالی ہے) چلایا پھر اس سے پانی اتارا پھر اس سے طرح طرح کے پھل نکالے، اسی طرح ہم مردوں کو نکالیں گے کہیں تم نصیحت مانو ''۔ (الاعراف:۵۷)

پس جب اللہ تعالیٰ بارش کے ذریعے مردہ زمین کو زندگی دے کر سرسبز بنادیتا ہے تو وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ مُردوں کو دوبارہ زندگی عطا فرمادے۔

☆ '' بولا، ایسا کون ہے کہ ہڈیوں کو زندہ کرے جب وہ بالکل گل گئیں؟ تم فرماؤ، انہیں وہ زندہ کرے گا جس نے پہلی بار انہیں بنایا، اور اسے ہر پیدائش کا علم ہے''۔ (یٰسٓ:۷۹)

کافروں نے گلی سڑی ہڈیاں دکھا کر کہا، کیا خدا اسے دوبارہ زندہ کرے گا؟ اس پر ارشاد ہوا، جب اس کا وجود نہ تھا اسوقت ہم نے اسے تخلیق کیا اور کسی شے کا دوبارہ بنانا اسکی ایجاد سے آسان ہوا کرتا ہے تو جب ہم پہلی بار بناچکے تو اب دوبارہ زندہ کرنا بدرجہٗ اولیٰ آسان ہے۔

اِیَّاکَ نَعْبُدُ:

اس آیت کریمہ کے پچھلی آیتوں کے ساتھ تعلق پر غور کریں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں پیدا کیا اور ہماری پرورش کی اس لیے وہ ہمارا رب ہے۔ ہم گناہ کرتے ہیں وہ چھپاتا ہے اور اپنی کمال مہربانی سے فوری عذاب نہیں دیتا کیونکہ وہ رحمٰن ہے۔ ہم توبہ کرتے ہیں وہ بخش دیتا ہے کیونکہ وہ رحیم ہے۔ وہ ہمارا ہی مالک ہے اور جزاوسزا کے دن کا بھی تاکہ فرمانبرداروں کو جنت عطا کرے اور منکروں کو عذاب۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں کیونکہ اسکے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ فرماتا ہے،'' میں ہی تمہارا رب ہوں اسلیے میری عبادت کرو''۔ (الانبیاء:۹۲)

سابقہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا ذکر کیا گیا اب بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کو خطاب کیا جارہا ہے تاکہ بندہ اپنے رب کی بارگاہ میں جسم ودل کے ساتھ حاضر ہوجائے اور یہ تصور کرے کہ اسکا رب اپنی تمام تر رحمتوں اور عنایتوں کے ساتھ اسے دیکھ رہا ہے۔ یہاں نَعْبُدُکَ نہیں فرمایا کہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں کیونکہ اس میں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تیرے علاوہ دوسروں کی بھی (معاذ اللہ)۔ اسلیے یہ تعلیم دی گئی اِیَّاکَ نَعْبُدُ۔ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ '' نَعْبُدُ '' جمع کے صیغہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عوام کی عبادات محبوبانِ خدا کی عبادات کے ساتھ قبولیت کا درجہ پاتی ہیں۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ ہر عبادت کی تکمیل آقا ومولیٰ ﷺ کی اطاعت سے ہی ہوتی ہے۔ عبادت محض نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ ہی کا نام نہیں بلکہ یہ پوری زندگی پر محیط ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا،'' اور میں نے جن اور آدمی اسلیے ہی بنائے کہ میری بندگی کریں''۔ (الذٰریٰت:۵۶)

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان ہر وقت مسجد میں بیٹھا تلاوت وتسبیح اور دیگر عبادات میں مشغول رہے بلکہ اسکا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ ہمارا اس بات پر پختہ ایمان ہو کہ اللہ تعالیٰ ہمارا مالک ومعبود ہے اور ہم اسکے عاجز بندے ہیں۔ بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں جو کچھ کریں وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اور اسکے حبیب ﷺ کی اطاعت کے مطابق ہو۔ نیز جن باتوں سے اللہ تعالیٰ اور رسول کریم ﷺ نے منع فرمایا، ہم ان سے بچتے رہیں تو ایسی صورت میں ہماری زندگی کا ہر لمحہ اور ہر عمل عبادت قرار پائے گا۔

عبادت سے مراد انتہائی عاجزی اور انکساری کا اظہار ہے۔ نماز ایک عبادت ہے لیکن قیام، رکوع کی طرح جھکنا اور دوزانو بیٹھنا وغیرہ، یہ امور اگر نماز سے خارج ادا کیے جائیں تو کوئی بھی انہیں عبادت نہیں سمجھتا۔ اسکا سبب یقیناً یہ ہے کہ یہ افعال جسکے سامنے ادا کیے جائیں اگر اسے معبود سمجھیں تو یہ سب کام عبادت ہونگے اور اگر معبود نہ سمجھیں تو یہی افعال تعظیم واحترام کہلائیں گے، عبادت نہیں۔ البتہ غیر خدا کے لیے سجدہ تعظیمی حرام ہے۔

محبوبانِ خدا کی تعظیم:

سیدُ الانبیاء ﷺ کی تعظیم فرضِ عین بلکہ ایمان کی جان ہے۔

رب تعالیٰ کا فرمان ہے، ''اے لوگو! تم اللہ اور اسکے رسول پر ایمان لاؤ اور رسول کی تعظیم وتوقیر کرو اور صبح وشام اللہ کی پاکی بولو''۔ (الفتح:۹، کنزالایمان)

ثابت ہوا کہ ایمان کے بغیر تعظیم وتوقیر قبول نہ ہوگی اور حضور ﷺ کی تعظیم وتوقیر کے بغیر ساری عبادات اور نیکیاں بیکار ہونگی۔ آقا کریم ﷺ کی تعظیم کا تقاضا ہے کہ ان تمام چیزوں کی بھی تعظیم کی جائے جو آپ سے نسبت رکھتی ہوں۔ صحابہ کرام اپنے آقا ومولیٰ ﷺ کا تھوک مبارک، بال مبارک اور وضو کا مستعمل پانی زمین پر نہ گرنے دیتے بلکہ لعاب دہن اور اعضائے وضو کا دھووَن اپنے چہروں پر مل لیتے اور بال مبارک حصولِ برکت کے لیے محفوظ کر لیتے۔ (بخاری، مسلم)

''نسبت'' ایک ایسی عظیم الشان حقیقت ہے جس کا انکار ممکن نہیں۔ نسبت سے عظمت ملتی ہے۔ قرآن کریم نے بارہا نسبتوں کی عظمتیں بیان فرمائیں ہیں:۔

☆ پتھروں سے بنا ہوا وہ گھر جسے اللہ تعالیٰ کے نبیوں نے بنایا وہ برکتوں والا ہے اور اسکا حج فرض ہے۔ (ال عمران:۹۶)

☆ جن پہاڑیوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی نیک بندی حضرت ہاجرہ علیہا السلام سے ہوگئی انہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیاں قرار دیکر انکے درمیان سعی کرنے کا حکم دیا۔ (البقرۃ:۱۵۸)

☆ وہ پتھر جس پر کھڑے ہوکر ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر فرمائی تھی، وہ آپکے پاؤں مبارک لگ جانے کے باعث اتنا مقدس ومعظم ہوگیا کہ رب کریم نے اسے نماز کی جگہ بنانے کا حکم دیا اور اسے اپنی ایک نشانی قرار دیا۔ (البقرۃ:۱۲۵، ال عمران:۹۷)

☆ سیدنا موسیٰ وہارون علیہما السلام کا لباس مبارک اور استعمال کی چیزیں ایک صندوق میں تھیں جس جنگ میں یہ بنی اسرائیل کے ساتھ ہوتا، اسکی برکت سے وہ فتح پاتے۔ اس صندوق کو فرشتے اٹھا کر لائے۔ (البقرۃ:۲۴۸)

☆ وہ قمیص جو سیدنا یوسف علیہ السلام کے جسم مبارک سے لگی، اسکی برکت سے بے نور آنکھیں روشن ہوگئیں۔ (یوسف:۹۳)

☆ دن تو سب برابر ہیں لیکن جن دنوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں سے ہوجائے وہ ''ایام اللہ'' قرار پاتے ہیں اور محترم ومکرم ہوجاتے ہیں۔ (ابراہیم:۵)

☆ دنیا میں روزانہ بیشمار جانور ذبح ہوتے ہیں لیکن وہ جانور جو راہِ خدا میں اسکے حکم سے قربان کیے جاتے ہیں، قرآن انہیں اللہ کی نشانیاں قرار دیتا ہے۔ (الحج:۳۶)

خلاصہ یہ ہے کہ جس شے کو اور جس ہستی کو اللہ تعالیٰ سے نسبت ہوجائے، اسکا ادب واحترام ہم پر لازم ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے، ''اور جو اللہ کے نشانوں کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کی پرہیزگاری سے ہے''۔ (الحج:۳۲، کنزالایمان)

قرآن کریم نہ صرف اللہ تعالیٰ سے نسبت رکھنے والی ہستیوں اور چیزوں کی تعظیم کا حکم دیتا ہے بلکہ وہ ایسی عظیم نسبت والی چیزوں اور ہستیوں کی بے ادبی سے باز رہنے کی تلقین بھی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو ناقۃ اللہ قرار دیکر اسکی بے ادبی سے باز رہنے کا حکم دیا مگر قومِ ثمود نے اسکی پرواہ نہ کی۔ ارشاد ہوا، ''تو انہوں نے اسے جھٹلایا پھر ناقہ کی کوچیں کاٹ دیں تو ان پر ان کے رب نے ان کے گناہ کے سبب تباہی ڈال کر وہ بستی برابر کردی''۔ (الشمس:۱۴)

غور فرمائیے کہ جب اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے محبوب بندے سے نسبت رکھنے والی اونٹنی کی اتنی عظمت ہے تو اسکے انبیاء واولیاء کرام کس قدر وجاہت وعظمت والے ہونگے؟ اسی لیے رب ذوالجلال کا فرمانِ عالیشان ہے، ''جس نے میرے ولی سے عداوت کی اسکے خلاف میرا اعلانِ جنگ ہے''۔ (بخاری)

اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ:

اس آیت میں عبادت کے علاوہ استعانت کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کے اقرار کے بعد بندہ عرض کرتا ہے، ''اے اللہ! ہم تجھی سے مدد چاہتے ہیں''۔

استعانت کی دو قسمیں ہیں، حقیقی اور مجازی۔

استعانت حقیقی یہ ہے کہ کسی کو قادر بالذات، مالک مستقل اور حقیقی مددگار سمجھ کر مدد مانگنا یہ اللہ تعالیٰ ہی کی شان کے لائق ہے۔ اگر کسی مخلوق کے متعلق یہ عقیدہ ہو کہ وہ عطائے الٰہی کے بغیر خود اپنی ذات سے مدد کرنے کی قدرت رکھتا ہے تو یہ شرک ہوگا اور کوئی مسلمان بھی انبیاء کرام اور اولیائے عظام کے متعلق ایسا عقیدہ نہیں رکھتا۔

استعانت مجازی یہ ہے کہ مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی مدد کا مظہر، حصولِ فیض کا ذریعہ اور حاجت روائی کا وسیلہ جان کر اس سے مدد مانگی جائے، یہ حق ہے اور قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔

☆ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں سے مدد مانگی۔ ارشاد ہوا، ''اے ایمان والو! اللہ کے مددگار ہوجاؤ جیسے عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا تھا، کون ہے جو اللہ کی طرف

میری مدد کریں"۔(الصف:۱۴)

☆موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی کو مددگار بنانے کی دعا کی جو قبول ہوئی۔ارشاد ہوا،"(الٰہی) میرے بھائی ہارون سے میری کمر مضبوط کر"۔(طٰہٰ:۳۱،۳۲)

☆اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے دین کے لئے مدد طلب فرمائی۔ارشاد ہوا،"اے ایمان والو!اگر تم دینِ خدا کی مدد کرو گے اللہ تمہاری مدد کرے گا"۔(محمد:۷)

☆مومنوں کو صبر اور نماز سے مدد مانگنے کا حکم دیا گیا۔(البقرہ:۱۵۳)

☆حضرت ذوالقرنین نے بھی لوگوں سے مدد مانگی۔(الکہف:۹۵)

☆حضرت سلیمان علیہ السلام نے تخت بلقیس لانے کیلئے مدد مانگی۔(النمل:۳۸)

☆نیک کاموں میں مسلمانوں کو مددگار بننے کا حکم دیا گیا۔(المائدہ:۲)

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں سے مدد مانگنا انبیاء کرام علیہم السلام اور صالحین کا طریقہ ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہوا،"اے غیب کی خبریں بتانے والے!اللہ تمہیں کافی ہے اور یہ جتنے مسلمان تمہارے پیرو ہوئے"۔(الانفال:۶۴)

دوسری جگہ فرمایا،"بیشک اللہ ان کا مددگار ہے اور جبریل اور نیک ایمان والے اور اسکے بعد فرشتے مدد پر ہیں"۔(التحریم:۴،کنزالایمان)

ایک اور فرمان عالیشان ہے،"بیشک تمہارے مددگار تو صرف اللہ تعالیٰ اور اسکا رسول اور وہ مسلمان ہیں جو نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور رکوع کرتے ہیں"۔(المائدہ:۵۵)

ان آیات کریمہ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ بھی مددگار ہے،ملائکہ بھی اور اولیاء وصالحین بھی۔فرق یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مددگار و مشکل کشا ہونا بالذات اور مخلوق سے بے نیاز وغنی ہو کر ہے اور اسکی صفات ازلی،ابدی،اور لامحدود ولامتناہی ہیں،جبکہ بندوں کا مددگار و مشکل کشا اور داتا ہونا اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہے اور بندوں کی صفات حادث،فانی اور اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْن کی تفسیر میں فرماتے ہیں،"یہ سمجھنا چاہئے کہ مخلوق سے ایسی استعانت حرام ہے جس میں مخلوق ہی پر اعتماد ہو اور اسے اللہ تعالیٰ کی امداد کا مظہر نہ جانے۔اگر توجہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف ہو اور مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی امداد کا مظہر جانے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت اور کارخانہ اسباب پر نظر کرتے ہوئے اس سے ظاہری طور پر مدد مانگے تو یہ راہ معرفت سے دور نہیں اور یہ استعانت شریعت میں جائز ہے۔اس قسم کی استعانت انبیاء کرام اور اولیاء عظام نے بھی مخلوق سے کی ہے اور درحقیقت یہ استعانت غیر اللہ سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہی سے استعانت ہے"۔(تفسیر عزیزی جلد اول ص ۸)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اس بارے میں رقم طراز ہیں،

"اس استعانت ہی کو دیکھیے کہ جس معنی پر غیر خدا سے شرک ہے یعنی قادر بالذات و مالک مستقل جان کر مدد مانگنا،ان معنوں میں ہی اگر بیماری کے علاج میں طبیب یا دوا سے مدد طلب کرے یا فقیری کی حاجت میں امیر یا بادشاہ کے پاس جائے یا انصاف کرانے کو کسی کچہری میں مقدمہ لڑائے بلکہ کسی سے روزمرہ کے معمولی کاموں میں مدد لے جو یقیناً تمام منکرینِ استعانت روزانہ اپنی عورتوں،بچوں اور نوکروں سے کرتے کراتے رہتے ہیں مثلاً یہ کہنا کہ فلاں چیز اٹھا دے یا کھانا پکادے،سب قطعی شرک ہے کہ جب یہ جانا کہ اس کام کے کر دینے پر خود انہیں اپنی ذات سے بے عطائے الٰہی قدرت ہے تو صریح کفر و شرک میں کیا شبہ رہا؟اور جس معنی پر ان سب سے استعانت شرک نہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی مدد کا مظہر،واسطہ،وسیلہ اور سبب جان کر تو انہی معنوں میں انبیاء کرام و اولیاء عظام سے مدد مانگنا کیونکر شرک ہوگا؟(برکات الامداد ص ۲۸)

اس مسئلے پر غیر مقلدوں کے پیشوا نواب وحید الزماں لکھتے ہیں،"جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ جمال گوٹہ از خود دست لاتا ہے یا آگ ازخود جلاتی ہے وہ مشرک ہے اور جو یہ جانتا ہے کہ جمال گوٹہ دست لانے کا سبب بنتا اور آگ کا جلانا اللہ تعالیٰ کے حکم اور اُسکے اِذن و ارادے سے ہے تو وہ توحید پرست ہے مشرک نہیں"۔(ہدیۃ المہدی ص ۱۷)

استعانت بعد از وصال:

قرآن وحدیث کے واضح دلائل سن کر بعض لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ"زندوں سے استعانت کے ہم بھی قائل ہیں مگر مُردوں سے استعانت شرک ہے"۔اس کے جواب میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں،

"جو شرک ہے وہ جس کے ساتھ کیا جائے گا شرک ہوگا اور ایک کے لئے شرک نہیں تو وہ کسی کے لئے شرک نہیں ہو سکتا۔کیا اللہ کے شریک مردے نہیں ہو سکتے،زندے ہو سکتے ہیں؟دور کے نہیں ہو سکتے،پاس کے ہو سکتے ہیں؟انبیاء نہیں ہو سکتے،حکیم ہو سکتے ہیں؟انسان نہیں ہو سکتے،فرشتے ہو سکتے ہیں؟حاشا للہ!اللہ عزوجل کا شریک کوئی نہیں ہو سکتا"۔(برکات الامداد لاھل الاستمداد ص ۲۸)

غیر مقلدوں کے پیشوا نواب وحید الزماں لکھتے ہیں،"عجیب ترین بات یہ ہے کہ ہمارے کچھ(غیر مقلد)بھائیوں نے اس مسئلہ میں زندوں اور مردوں کا فرق کیا ہے اور گمان کیا ہے کہ وہ امور جو بندوں کی قدرت میں ہیں،اُن امور میں زندوں سے مدد مانگنا شرک نہیں جبکہ مردوں سے مدد مانگنا شرک ہے حالانکہ یہ واضح طور پر غلط ہے کیونکہ غیر اللہ ہونے میں زندہ اور مردہ برابر ہیں"۔(ہدیۃ المہدی،ص ۱۸)

دیوبندی مکتبہ فکر کے پیشوا مولوی اشرفعلی تھانوی نے بھی یہی عقیدہ تسلیم کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں،'' جو استعانت و استمداد باعتقاد علم و قدرت مستقل ہو وہ شرک ہے اور جو باعتقاد علم و قدرت غیر مستقل ہو اور وہ علم و قدرت کسی دلیل سے ثابت ہو جائے تو جائز ہے خواہ جس سے مدد مانگی جائے وہ زندہ ہو یا مردہ''۔(امداد الفتاویٰ ج۴ص ۹۹)

بعض منکرین یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ لوگ وفات یافتہ انبیاء و صالحین سے ایسی چیزیں مانگتے ہیں جن کی قدرت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں، اس لئے یہ استعانت شرک ہے۔

مکہ مکرمہ کے جلیل القدر عالم ڈاکٹر سید محمد علوی مالکی مدظلہ العالی اس اعتراض کے جواب میں فرماتے ہیں،

''مسلمانوں کے مسلک پر بدگمانی اور کج فہمی کے سوا اس بات کی کوئی حیثیت نہیں ہے انبیاء و صالحین کو مسلمان وسیلہ و سبب بناتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے جو مراد مانگی جارہی ہے یہ اسے پوری کرنے میں سبب بن جائیں، انکی دعا و شفاعت اور توجہ کے سبب اللہ تعالیٰ مراد پوری فرمادے۔اور یہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ ایک نابینا صحابی نے بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر آپ کو وسیلہ بنایا اور اللہ تعالیٰ سے طلب و استغاثہ میں آپ وسیلہ بنے۔اللہ تعالیٰ کے اذن سے وہ مراد پوری بھی ہوئی اور نبی کریم ﷺ نے اس نابینا صحابی سے یہ نہیں فرمایا کہ تم نے مجھ سے یہ طلب و توسل کر کے شرک کیا ہے۔

اسی طرح دوسرے خوارق عادات کی طلب مثلاً لاعلاج مرض سے بغیر دوا کے شفایابی، بغیر بادل کے بارش برسانا، بصارت واپس کر دینا، انگلیوں سے پانی کا فوارہ جاری کرنا، تھوڑے سے کھانے کو زیادہ بنادینا وغیرہ وغیرہ، یہ ساری چیزیں عادۃً انسانی قدرت سے باہر ہیں لیکن رسول کریم ﷺ سے یہ چیزیں مانگی گئیں اور آپ کے توسل و توسط سے صحابہ کرام کو یہ چیزیں ملیں۔کبھی آپ نے یہ نہیں فرمایا،''تم نے مجھ سے ایسی چیزیں مانگی ہیں جن پر صرف اللہ قادر ہے اس لئے تم مشرک ہو گئے۔تمہارے لیے تجدید اسلام ضروری ہے''۔

کیا آج کے علمبرداران توحید (معاذ اللہ) حضور ﷺ سے بھی زیادہ توحید کی حقیقت سے واقف ہیں؟ عالم تو درکنار کوئی جاہل مسلمان بھی کبھی ایسی بات نہیں سوچ سکتا''۔

(مفاهيم يجب ان تصحح ص ٢٣٤)

اہل سنت و جماعت کے پیشوا شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس عنوان پر اہل سنت کے عقیدہ کی بہترین ترجمانی فرمائی ہے، وہ فرماتے ہیں،

''حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ جس کی زندگی میں اس سے مدد مانگی جاتی ہے اس سے بعد وفات بھی مدد مانگی جائے گی۔ایک عظیم بزرگ نے فرمایا، ''میں نے چار مشائخ کو اپنی قبروں میں اس طرح تصرف کرتے ہوئے دیکھا جس طرح وہ اپنی زندگی میں تصرف کیا کرتے تھے یا اس سے بھی زیادہ۔ان میں حضرت شیخ معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ اور سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں''۔

سیدی احمد بن مرزوق رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، ایک دن شیخ ابوالعباس حضرمی رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے دریافت کیا، کہ زندہ کی امداد قوی ہے یا مردہ کی؟ میں نے کہا کچھ لوگ کہتے ہیں کہ زندہ کی امداد زیادہ قوی ہے مگر میں یہ کہتا ہوں کہ وفات یافتہ کی مدد زیادہ قوی ہے۔شیخ نے فرمایا،''ہاں اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اسکے پاس ہے''۔

اس بارے میں صوفیہ کرام سے اس قدر روایات منقول ہیں کہ شمار سے باہر ہیں پھر کتاب و سنت اور اقوال صالحین میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اس عقیدہ کے منافی اور مخالف ہو۔آیات و احادیث سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ روح باقی یعنی زندہ ہے اور اسے زائرین اور انکے حالات کا علم اور شعور ہوتا ہے۔کاملین کی روحوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قرب اسی طرح ثابت ہے جس طرح زندگی میں تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ۔اولیاء کرام کی کرامات برحق ہیں اور انہیں کائنات میں تصرف کی قوت و طاقت حاصل ہے۔یہ سب کچھ انکی ارواح کرتی ہیں اور وہ باقی ہیں۔حقیقی تصرف کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے اور سب کچھ اسی کی قدرت کا کرشمہ ہے''۔(اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ ج ا ص ۷۱۵)

توسل بعد از وصال:

اہل لغت نے وسیلہ کی تعریف یوں کی ہے، اَلْوَسِیْلَةُ مَا یَتَقَرَّبُ بِهٖ اِلَی الْغَیْرِ۔

(لسان العرب ج ۱۱ ص ۷۲۵)

جس کے ذریعے کسی دوسری چیز کا قرب حاصل کیا جائے، اسے ''وسیلہ'' کہتے ہیں جبکہ کسی شے کو کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ بنانا ''توسل'' ہے۔شرعی اصلاح میں توسل یہ ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کا قرب اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کسی ایسی ہستی یا عمل یا شے کو ذریعہ بنایا جائے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہو۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہے،''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ ڈھونڈو''۔(المائدہ: ۳۵ کنزالایمان)

اس آیت مقدسہ میں وسیلہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔بعض لوگ صرف اعمال صالحہ کو وسیلہ قرار دیتے ہیں حالانکہ کوئی شخص ہرگز یہ نہیں جانتا کہ اس کے اعمال بارگاہ الٰہی میں مقبول ہیں یا نہیں؟ جبکہ اللہ تعالیٰ کے محبوب نبی کریم ﷺ کے بارگاہ الٰہی میں مقبول ہونے میں کسی مومن کو شبہ نہیں ہو سکتا۔تو جب ان اعمال صالحہ کو جو کہ مخلوق ہیں اور

جن کی مقبولیت مشکوک ہے، وسیلہ بنایا جاسکتا ہے تو سب سے بہتر مخلوق، نبی کریم ﷺ کو وسیلہ کیوں نہیں بنایا جاسکتا جو اللہ تعالیٰ کے محبوب و مقبول بندے ہیں۔
حضور اکرم ﷺ کے وصالِ ظاہری کے بعد آپ کو وسیلہ بنانے کے متعلق ایک اہم حدیث ملاحظہ کیجیے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص کسی ضرورت کے لیے بار بار حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں جاتا لیکن وہ توجہ نہ فرماتے۔ اس شخص کی ملاقات حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے ہوئی تو اس نے شکایت کی۔ آپ نے فرمایا، تم وضو کر کے دو رکعت نفل ادا کرو پھر یہ دعا مانگو،

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَیْکَ بِنَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحْمَةِ یَا مُحَمَّدُ اِنِّیْ قَدْ تَوَجَّھْتُ بِکَ اِلٰی رَبِّیْ فِیْ حَاجَتِیْ ھٰذِهٖ لِتُقْضٰی لِیْ اَللّٰھُمَّ فَشَفِّعْهُ فِیَّ۔

''اے اللہ! میں تجھ سے مانگتا ہوں اور تیری طرف توجہ کرتا ہوں تیرے نبی حضرت محمد ﷺ کے وسیلے سے جو رحمت والے نبی ہیں۔ یارسول اللہ ﷺ! میں آپ کے وسیلے سے اپنے رب کے دربار میں اس لیے متوجہ ہوا ہوں کہ میری یہ حاجت پوری ہوجائے۔ یا اللہ! حضور کی شفاعت میرے حق میں قبول فرما''۔
چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دروازے پر آیا تو دربان اس کا ہاتھ پکڑ کر امیر المومنین کی خدمت میں لے گیا۔ آپ نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور اس کی حاجت پوچھی، اس نے اپنی ضرورت کا ذکر کیا تو آپ نے اس کی ضرورت پوری کردی اور فرمایا، جب بھی تمہیں کوئی حاجت پیش آئے میرے پاس آجانا۔ وہ شخص وہاں سے نکل کر عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے ملا اور ان سے کہا، اللہ تعالیٰ آپ کو جزا دے، اگر آپ امیر المومنین سے میرے بارے میں بات نہ کرتے تو وہ کبھی میری طرف متوجہ نہ ہوتے اور میری حاجت پوری نہ کرتے۔
انہوں نے جواب میں فرمایا، اللہ تعالیٰ کی قسم! میں نے امیر المومنین سے کوئی گفتگو نہیں کی بلکہ اصل بات یہ ہے کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک نابینا شخص خدمتِ اقدس میں آیا اور بینائی کے لیے دعا کی درخواست کی تو آقا و مولیٰ ﷺ نے اسے یہی طریقہ اور یہی دعا تعلیم فرمائی (جو کہ مذکور ہوچکی) اور خدا کی قسم ابھی ہم وہاں سے اٹھے بھی نہیں تھے کہ وہ نابینا شخص ہمارے پاس ایسے آیا کہ گویا وہ نابینا ہی نہ تھا۔
اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

(معجم الصغیر للطبرانی ج ۱ ص ۱۸۳، مجمع الزوائد ج ۲ ص ۲۷۹)

حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ سے مروی نابینا صحابی والی حدیث حاکم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، بیہقی، طبرانی اور ابن خزیمہ نے بھی روایت کی ہے۔ نیز امام ترمذی، امام بیہقی اور امام ذہبی نے فرمایا، اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ امام سیوطی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو امام بخاری نے بھی اپنی تاریخ میں روایت کیا ہے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ
(المستدرک ج ۱ ص ۵۱۹، خصائص کبریٰ ج ۲ ص ۲۰۱)

اس حدیث سے دو اہم باتیں واضح ہوئیں۔ اول یہ کہ نبی کریم ﷺ کا خود یہ عقیدہ ہے کہ مجھے بارگاہِ الٰہی میں وسیلہ بنانا جائز ہے اسلیے انہوں نے اپنا وسیلہ اختیار کرنے کی تعلیم دی۔ دوم یہ کہ ''یارسول اللہ ﷺ'' پکارنے کی تعلیم خود آقا و مولیٰ ﷺ نے دی ہے لہٰذا ''ندائے یارسول اللہ ﷺ'' ہرگز شرک یا بدعت نہیں۔
شارحین فرماتے ہیں کہ جب اس شخص نے یہ خیال ظاہر کیا کہ شاید اس کی حاجت کے سلسلے میں عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ نے امیر المومنین سے کوئی بات کی ہے تو صحابی رسول نے اسکے خیال کو غلط قرار دیتے ہوئے فوراً وہ حدیث بیان فرمائی جس میں انکے سامنے ایک نابینا صحابی کو آنکھیں مل گئی تھیں تاکہ اس پر یہ واضح ہوجائے کہ اسکی حاجت حضور ﷺ کا وسیلہ اختیار کرنے، انکو پکارنے اور ان سے مدد مانگنے کی وجہ سے پوری ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کے وسیلے سے حاجت جلد پوری فرماتا ہے۔ الحمد للہ! اہل سنت کا عقیدہ بھی صحابہ کرام کے عقیدے کے عین مطابق ہے۔
حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے توسل والی حدیث کے حوالے سے علامہ سید محمد علوی مالکی مکی فرماتے ہیں، ''جو شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کلام کا یہ مطلب نکالے کہ انہوں نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا وسیلہ پیش کیا اور حضور ﷺ سے توسل نہیں کیا کیونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ زندہ تھے اور حضور ﷺ کا وصال ہوچکا تھا، اُس شخص کی عقل مرچکی ہے، اس پر وہم غالب آچکا ہے اور اس نے اپنے بارے میں کوئی اچھا تاثر نہیں دیا، وہ سخت تعصب میں مبتلا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو صرف اس لیے وسیلہ بنایا کہ انہیں نبی کریم ﷺ سے قرب حاصل ہے۔ چنانچہ ان کا یہ فرمانا، وَاِنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَیْکَ بِعَمِّ نَبِیِّنَا فَاسْقِنَا۔ ''ہم تیری بارگاہ میں اپنے نبی ﷺ کے چچا کو وسیلہ بناتے ہیں تو بارش عطا فرما''۔ اس دعا میں بہتر طور پر نبی ﷺ سے توسل کیا گیا ہے۔
وہ شخص بڑا ناانصاف اور خطا کار ہے جو توسل کی وجہ سے مسلمانوں کو مشرک قرار دیتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ زندہ شخص سے توسل جائز ہے، کیونکہ اگر توسل شرک ہوتا تو زندہ اور فوت شدہ کسی سے بھی جائز نہ ہوتا۔ کیا ایسا شخص یہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی نبی یا فرشتے یا ولی کو رب ماننا یا اسے عبادت کا مستحق سمجھنا کفر و شرک ہے اور یہ نہ اسکی زندگی میں جائز ہے نہ وصال کے بعد۔ کیا تم نے کسی کو یہ کہتے سنا ہے کہ غیر خدا کو اسکی زندگی میں رب ماننا جائز ہے اور اسکی وفات کے بعد شرک ہے؟
پس دلائل سے واضح ہوگیا کہ کسی محترم و معظم ہستی کو بارگاہِ الٰہی میں وسیلہ بنانا اسکی عبادت نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ اسے رب سمجھ کر وسیلہ بنائے جیسا کہ بت پرست اپنے بتوں کے بارے میں عقیدہ رکھتے تھے تو یہ شرک ہے۔ اور اگر کوئی شخص کسی معظم ہستی کو رب کا محبوب سمجھتے ہوئے حکمِ الٰہی کے مطابق اسے وسیلہ بنائے تو یہ توسل اللہ تعالیٰ ہی کی

عبادت قرار پائے گا"۔(مفاهيم يجب ان تصحح ص ٢٠٢)

توحید اور شرک:

☆ہدایت دینے والا اللہ تعالیٰ ہے اور اسکی عطا سے اسکے محبوب رسول ﷺ بھی ہدایت دیتے ہیں۔ارشاد ہوا،"اور بیشک تم ضرور سیدھی راہ بتاتے ہو"۔(الشوریٰ:۵۲)

☆شفا دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے مگر اسکی عطا سے دواؤں میں اور قرآن میں بھی شفا ہے۔ارشاد ہوا،"اور ہم قرآن میں اتارتے ہیں وہ چیز جو ایمان والوں کے لیے شفا اور رحمت ہے"۔(بنی اسرائیل:۸۲)

شہد کے بارے میں فرمایا گیا،"اسمیں لوگوں کے لیے شفا ہے"۔(النحل:۶۹)

☆بیشک اللہ تعالیٰ ہی اولاد دینے والا ہے اور اسکی عطا سے اسکے مقرب بندے بھی اولاد دیتے ہیں۔حضرت جبریل علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام سے فرمایا،

"میں تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تاکہ میں تجھے ایک ستھرا بیٹا دوں"۔(مریم:۱۹)

☆اللہ تعالیٰ ہی موت وزندگی دینے والا ہے اور اسکے حکم سے یہ کام مقرب بندے کرتے ہیں۔ارشاد ہوا،"تمہیں وفات دیتا ہے موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر ہے"۔(السجدہ:۱۱)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی طاقت وتصرف کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں،"میں مردے زندہ کرتا ہوں اللہ کے حکم سے"۔(ال عمران:۹،کنزالایمان)

☆قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی بعض صفات بندوں کے لیے صراحتاً بیان فرمائی ہیں جیسے سورۃ الدھر آیت ۲ میں انسان کو"سمیع وبصیر" کہا گیا،سورۃ البقرۃ آیت ۱۴۳ میں حضور ﷺ کو"شھید" فرمایا گیا،سورۃ التوبۃ آیت ۱۲۸ میں حضور ﷺ کا"رؤف ورحیم" ہونا بیان ہوا،اور سورۃ التحریم آیت ۴ میں اولیاء وصالحین اور فرشتوں کا"مددگار و مولیٰ" ہونا بیان فرمایا گیا۔اسی طرح حیات،علم،کلام،ارادہ وغیرہ متعدد صفات بندوں کے لیے بھی بیان ہوئی ہیں۔

اس بارے میں یہ حقیقت ذہن نشین رہے کہ جب بھی کوئی صفت اللہ تعالیٰ کے لیے بیان ہوگی تو وہ ذاتی،واجب،ازلی،ابدی،لامحدود اور شانِ خالقیت کے لائق ہوگی اور جب وہ کسی مخلوق کے لیے بیان ہوگی تو عطائی،ممکن،حادث،عارضی،محدود اور شانِ مخلوقیت کے لائق ہوگی۔پس جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کسی اور ذات کے مشابہ نہیں اسی طرح اسکی صفات بھی مخلوق کی صفات کے مماثل نہیں۔توحید وشرک میں یہی فرق ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ :

اس سورت کو سورۃ الدعا بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ ہمیں بارگاہِ الٰہی میں دعا مانگنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ابتدائی تین آیات میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کی گئی،چوتھی آیت میں بندے نے اللہ تعالیٰ کے مالک وغنی ہونے اور اپنے عاجز ومحتاج ہونے کا اقرار کیا اور اسکی بارگاہِ بے نیاز میں اپنی جبینِ نیاز جھکا دی پھر اسکی رحمتوں پر نظرِ امید رکھتے ہوئے اخلاصِ نیت کے ساتھ اپنی جھولی پھیلا دی اور عرض کیا،

اے ہمارے مالک ومعبود!ہمیں تیرے محبوب رسول ﷺ نے صراطِ مستقیم کا شعور عطا کیا۔یقیناً تیرے محبوب رسول ﷺ اور تیرے انعام یافتہ بندوں کا راستہ ہی صراطِ مستقیم ہے۔اے اللہ!ہم کمزور ہیں تو ہماری مدد فرما اور اپنے لطف وکرم سے ہمیں صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق دے اور ہمیں سیدھے راستے پر چلا تاکہ ہم اپنے مقصدِ حیات کو پا سکیں۔

اب ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ سیدھے راستے پر استقامت کی دعا مانگنے کی تعلیم اس قدر اہتمام سے کیوں دی گئی؟اس کا جواب یہ ہے کہ ابلیس انسان کا کُھلا دشمن ہے جس نے بارگاہِ الٰہی میں یہ اعلان کیا تھا کہ"میں ضرور تیرے سیدھے راستے پر انکی تاک میں بیٹھوں گا پھر ضرور میں انکے پاس آؤں گا،انکے آگے اور انکے پیچھے اور انکے دائیں اور انکے بائیں سے،اور تو ان میں اکثر کو شکر گذار نہ پائے گا"۔(الاعراف:۱۶،۱۷)

دوسری بات یہ ہے کہ ابلیس نہایت خطرناک دشمن ہے کیونکہ"وہ اور اسکا قبیلہ تمہیں وہاں سے دیکھتے ہیں کہ تم انہیں نہیں دیکھ سکتے"۔(الاعراف:۲۷)

ایسا دشمن ہمیں نظر نہ آئے اور ہمارے دین وایمان کی دولت لوٹنے اور ہمیں سیدھی راہ سے بھٹکا دینے کے درپے ہو،اس سے ہر لحہ ہوشیار رہنے کی اشد ضرورت ہے اسلیے سیدھی راہ پر استقامت کے لیے اللہ تعالیٰ سے استعانت کی دعا لازم ہے۔حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ نے بہت پیاری بات کہی۔فرمایا،

"اگر تیرا دشمن ایسا ہے کہ وہ ہر لحہ تجھے دیکھتا ہے اور تو اسکو نہیں دیکھ سکتا تو تجھے چاہیے کہ ایک ایسی طاقتور ہستی یعنی اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آ جا جو ہر لحہ تیرے دشمن کو دیکھتا ہے مگر تیرا دشمن اسے نہیں دیکھ سکتا"۔(تفسیر مظہری)

مفسرین کرام نے اسکی تفسیر میں ایک ایمان افروز نکتہ یہ بھی بیان کیا ہے کہ قربِ الٰہی اور معرفتِ ربانی کے بیشمار مدارج ہیں۔بندہ جب بھی یہ دعا کرتا ہے تو اسکا مقصود موجودہ قرب ومعرفت کے مقام سے اگلا بلند مقام ہوتا ہے۔

تفسیر مظہری میں ہے،"یہ دعا نبی کریم ﷺ اور تمام مومنوں کی دعا ہے،اگرچہ وہ پہلے ہی سے ہدایت پر تھے مگر پھر بھی رب تعالیٰ نے استقامت وثابت قدمی اور مزید ہدایت

طلب کرنے کی تعلیم دی کیونکہ اللہ تعالیٰ کے الطاف وہدایات کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے''۔

صراطِ مستقیم کیا ہے؟

''صراطِ مستقیم سے مراد اسلام یا قرآن یا خلقِ نبی کریم ﷺ یا حضور کے آل واصحاب ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صراطِ مستقیم اہلِ سنت کا راستہ ہے جو اہلِ بیت و اصحاب اور سنت وقرآن اور سوادِ اعظم سب کو مانتے ہیں''۔ (خزائن العرفان)

''الصراط المستقیم'' رسول کریم ﷺ کا اسم مبارک بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صراطِ مستقیم کی پہچان اگلی آیت میں یہ ارشاد فرمائی، ''راستہ اُن کا جن پر تو نے احسان کیا'' یعنی صراطِ مستقیم وہی راستہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ بندے چلتے رہے ہیں۔ یہ انعام یافتہ بندے کون ہیں؟ انکے متعلق فرمایا گیا، ''انبیاء اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ، یہ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں''۔ (النساء: ۶۹، کنزالایمان)

ثابت ہوا کہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور اولیائے صالحین کا راستہ ہی صراطِ مستقیم ہے۔ کسی نیک بندے کے اللہ کا انعام یافتہ ہونے کی پہچان کیا ہے؟ سورہ مریم آیت ۹۶ میں ارشاد ہوا، ''بیشک وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے عنقریب انکے لیے رحمٰن محبت کردے گا''۔

یعنی اللہ تعالیٰ انہیں اپنا محبوب بنالے گا اور اپنے بندوں کے دلوں میں بھی انکی محبت ڈال دے گا۔ صحیح مسلم کی حدیث میں بھی یہ موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو آسمان اور زمین والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔

اب آپ غور فرمائیے کہ وہ کون ہیں جو خلفائے راشدین، صحابہ کرام اور اہلبیت عظام دونوں کو اپنا پیشوا مانتے ہیں؟ یہ بھی غور فرمائیے کہ امام اعظم ابوحنیفہ کا تعلق کس گروہ سے ہے؟ سیدنا غوثِ اعظم کا تعلق کس گروہ سے ہے؟ داتا گنج بخش، خواجہ غریب نواز، مجدد الف ثانی، بابا فرید گنج شکر اور دیگر اولیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کا تعلق کس گروہ سے ہے؟ الحمدللہ! اہلِ سنت وجماعت ہی وہ گروہ ہے جس میں صحابہ واہلبیت سے لیکر آج تک تمام اولیاء کرام ظاہر ہوئے ہیں۔ اولیاء کرام کے نظریات اور انکی تعلیمات اس امر کی گواہ ہیں کہ یہ سب اہل سنت وجماعت سے ہیں۔ اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنت نے خوب فرمایا،

ترے غلاموں کا نقشِ قدم ہے راہِ خدا وہ کیا بہک سکے جو یہ سراغ لے کے چلے

غیب بتانے والے آقا ومولیٰ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے، بنی اسرائیل میں بہتّر (۷۲) فرقے ہوئے اور میری امت میں تہتّر (۷۳) فرقے ہونگے۔ ان میں صرف ایک گروہ جنتی ہے اور باقی سب فرقے جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ! وہ جنتی گروہ کون سا ہے؟ فرمایا، جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔ (ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ)

نبی کریم ﷺ نے چودہ سو سال پہلے یہ غیبی خبر دے دی تھی تاکہ اتنے سارے فرقوں میں سے جنتی گروہ کی شناخت ہوسکے۔ اس سلسلے میں سورہ فاتحہ کی یہ آیات بھی ذہن نشین رہیں، ارشاد ہوا، ''ہم کو سیدھا راستہ چلا، راستہ اُن کا جن پر تو نے احسان کیا''۔

ہم ہر نماز میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ الٰہی! ہمیں اپنے انعام یافتہ بندوں کے راستے پر چلا کیونکہ یہی سیدھا راستہ ہے۔ بتائیے کیا قرآن وحدیث کا راستہ سیدھا راستہ نہیں ہے؟ یقیناً قرآن وحدیث کا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے لیکن ربِ کریم خوب جانتا ہے کہ گمراہ لوگ قرآن تلاوت کریں گے مگر بات اپنے مطلب کی کریں گے اور ترجمہ وتفسیر میں اپنے فاسد نظریات داخل کردیں گے۔ یونہی حدیث پڑھیں گے مگر اسکا خودساختہ مفہوم بیان کرکے مسلمانوں کو دھوکا دیں گے۔ اسلیے اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام یافتہ بندوں کے راستے کو معیارِ حق قرار دے دیا تاکہ جو قرآن وحدیث کا عالم نہ ہو وہ بھی جان لے کہ صحابہ کرام واولیائے کاملین کا راستہ ہی صراطِ مستقیم ہے۔

قرآن کریم سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ وہ گروہ جس میں اولیاء کرام ہوں اور جو اولیاء کے راستے پر ہو، وہ صراطِ مستقیم پر ہے اور جنتی ہے۔ نیز اس حدیث پاک سے معلوم ہوا جو سرکارِ دوعالم ﷺ اور صحابہ کرام کے راستے پر ہے وہی جنتی ہے۔ اب آپ دیکھ لیجیے کہ صحابہ کرام حضور ﷺ کی کیسی تعظیم وتوقیر کرتے، انکی محبت کو ایمان کی جان سمجھتے، بارگاہِ الٰہی میں حاجت روائی کے لیے انہیں وسیلہ بناتے نیز حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لیے آقا ومولیٰ ﷺ کی بارگاہ میں فریاد کیا کرتے، اور سرکارِ دوعالم ﷺ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے تصرف واختیار سے انکی حاجت روائی اور مشکل کشائی فرماتے۔

حضور ﷺ نعمتیں تقسیم فرماتے ہیں:

اختصار کے ساتھ صحاح ستہ سے چند احادیث پیشِ خدمت ہیں:-

☆ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بارگاہِ نبوی میں حافظہ مانگا، آپ نے حافظہ عطا فرمایا۔

(بخاری ج ۱ ص ۲۲، مسلم ج ۲ ص ۳۰۲)

☆ حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے قوتِ قلبی مانگی، آپ کی دعا سے انہیں عطا ہوئی۔

(بخاری ج ۱ ص ۴۲۴، مسلم ج ۲ ص ۲۹۷)

☆ حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ نے جنت میں حضور کی رفاقت مانگی، آپ نے عطا فرمائی۔

(مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ)

☆ حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ نے بغیر حساب جنت میں جانے کی آرزو کی جو مالک ومختار رسولِ معظم ﷺ نے پوری فرمائی۔

(بخاری کتاب اللباس)

☆ عبداللہ بن عتیک رضی اللہ عنہ کی ٹوٹی ہوئی پنڈلی کو دستِ شفا پھیر کے جوڑ دیا۔

(بخاری ج ۲ ص ۵۷۷)

☆ ایک صحابی نے قحط سالی پر حضور ﷺ سے فریاد کی تو آپ کی دعا سے بارش ہوئی۔ پھر بارش کی کثرت پر فریاد کی تو آپکے اشارہ سے بارش رُکی۔

(بخاری ابواب الاستسقاء، مسلم)

☆ حدیبیہ میں صحابہ کرام نے پانی کے لیے فریاد کی تو آپ کی انگلیوں سے پانی جاری ہوا جس سے ڈیڑھ ہزار صحابہ سیراب ہوئے۔

(بخاری ج ۲ ص ۵۹۸، مسلم)

☆ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے گھر ہانڈی میں لعاب دہن ڈال دیا تو تھوڑے سے کھانے سے ایک ہزار صحابہ شکم سیر ہوگئے۔

(بخاری کتاب المغازی، مسلم ج ۲ ص ۱۷۸)

☆ ایک نابینا صحابی رضی اللہ عنہ نے آپکی بارگاہ میں فریاد کی اور آپکے وسیلے سے دعا کی تو اسے آنکھیں مل گئیں۔

(ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

☆ مدینے کے لوگ فجر کے بعد پانی کے برتن بارگاہِ نبوی میں لاتے تو حضور ﷺ اپنا ہاتھ پانی میں ڈبو دیتے تاکہ انہیں برکت ملے۔

(مسلم باب قربہ من الناس)

صحابہ کرام کا بارگاہِ نبوی میں حاجت روائی چاہنا انکے اس عقیدہ کی بناء پر تھا کہ محبوبِ کبریا ﷺ کا نعمتیں عطا فرمانا اور مشکل کشائی کرنا اللہ تعالیٰ ہی کا نعمتیں عطا فرمانا ہے۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوا، "اور کیا اچھا ہوتا اگر وہ اس پر راضی ہوتے جو اللہ ورسول نے ان کو دیا اور کہتے، ہمیں اللہ کافی ہے، اب دیتا ہے ہمیں اللہ اپنے فضل سے اور اللہ کا رسول، ہمیں اللہ ہی کی طرف رغبت ہے"۔ (التوبۃ: ۵۹) دوسری جگہ فرمایا "اور انہیں کیا برا لگا، یہی نا کہ اللہ ورسول نے انہیں اپنے فضل سے غنی کردیا"۔ (التوبۃ: ۷۴، کنزالایمان)

ان آیات سے واضح ہوا کہ عطائے الٰہی سے رسولِ اکرم ﷺ نعمتیں عطا فرماتے ہیں اور انکا عطا فرمانا رب کریم ہی کا عطا فرمانا ہے۔

ایک حدیث پاک میں سرکارِ دوعالم ﷺ نے اپنے قاسمِ نعمت ہونے کے متعلق یہ ارشاد فرمایا، اِنَّمَا اَنَا قَاسِم' وَاللّٰہُ یُعْطِیْ ۔"اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے اور میں اسکی نعمتیں تقسیم کرتا ہوں"۔ (بخاری کتاب العلم)

ایک اور حدیث پاک میں ارشاد ہوا، وَاِنِّی اُعْطِیْتُ مَفَاتِیْحَ خَزَائِنِ الْاَرْضِ۔ "اور مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں عطا فرمادی گئیں"۔ (بخاری کتاب الجنائز)

ان آیات واحادیث سے معلوم ہوا کہ سرکارِ دوعالم ﷺ کو رب کریم نے اپنی تمام نعمتوں کا مالک ومختار بنایا ہے اور اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتیں آقا ومولیٰ ﷺ کے دربارِ گہربار سے تقسیم ہوتی ہیں کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کے محبوب اور نائب مطلق ہیں۔ رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام کا یہی عقیدہ تھا اور الحمدللہ یہی عقیدہ اہلِ سنت کا ہے اور یہی صراطِ مستقیم ہے۔

ایک حدیث پاک میں سرکارِ دوعالم ﷺ نے اپنے قاسمِ نعمت ہونے کے متعلق یہ ارشاد فرمایا، **اِنَّمَا اَنَا قَاسِم" وَاللّٰہُ یُعْطِیْ** ۔"اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے اور میں اسکی نعمتیں تقسیم کرتا ہوں"۔ (بخاری کتاب العلم)

ایک اور حدیث پاک میں ارشاد ہوا، **وَاِنِّی اُعْطِیْتُ مَفَاتِیْحَ خَزَائِنِ الْاَرْضِ**۔ "اور مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں عطا فرمادی گئیں"۔ (بخاری کتاب الجنائز)

ان آیات واحادیث سے معلوم ہوا کہ سرکارِ دوعالم ﷺ کو رب کریم نے اپنی تمام نعمتوں کا مالک ومختار بنایا ہے اور اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتیں آقا ومولیٰ ﷺ کے دربارِ گہربار سے تقسیم ہوتی ہیں کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کے محبوب اور نائب مطلق ہیں۔ رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرام کا یہی عقیدہ تھا اور الحمدللہ یہی عقیدہ اہلِ سنت کا ہے اور یہی صراطِ مستقیم ہے۔

عقیدہ حیات النبی ﷺ:

موجودہ دور میں جبکہ بعض اہلِ بدعت، اہلِ سنت کو عظمتِ مصطفیٰ ﷺ سے برگشتہ کرنے کی سعی مذموم میں مصروف ہیں، حیات النبی ﷺ کا عقیدہ صحیح العقیدہ مسلمان ہونے کی علامت ہے۔ ہم اس عنوان کے تحت قرآنی آیات وتفاسیر اور احادیث مبارکہ کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے بعض انعام یافتہ بندوں کے ارشادات پیش کریں گے تاکہ یہ واضح ہوجائے کہ یہ عقیدہ صراطِ مستقیم والوں کی پہچان ہے۔

☆ ارشادِ باری تعالیٰ ہے، ''اور ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کے لیے''۔ (الانبیاء: ۱۰۷)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ آقا ومولیٰ ﷺ ہر وقت اور ہر لحہ ساری کائنات کے لیے رحمت ہیں اور رحمت ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آپ سارے جہان والوں کے لیے حیات ہوں لوگوں کے احوال سے باخبر ہوں، انکی پکار سنتے ہوں اور انکی مشکل کشائی وحاجت روائی پر بھی قدرت واختیار رکھتے ہوں۔

☆ رب تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد گرامی ہے، ''اے غیب بتانے والے! بے شک ہم نے آپ کو بھیجا حاضر وناظر''۔ (الاحزاب: ۴۵، الفتح: ۸)

اس آیت کی تفسیر میں جلیل القدر مفسرین کرام فرماتے ہیں، ''جن کی طرف آپ کو رسول بنا کر بھیجا آپ کو انکے احوال کا مشاہدہ کرنے والا بنایا''۔ (تفسیر جلالین)

''جن کی طرف آپ کو مبعوث کیا گیا آپ ان پر شاہد ہیں کیونکہ احوال ملاحظہ فرماتے ہیں اور انکے اعمال کا مشاہدہ کرتے ہیں''۔ (تفسیر روح المعانی)

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، ''مفسرین نے بیان کیا ہے کہ شَاهِدًا کا معنی یہ ہے کہ حضور ﷺ اپنی امت کے افعال کا مشاہدہ فرماتے ہیں''۔ (تفسیر کبیر)

☆ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا، ''اور یہ رسول تمہارے نگہبان وگواہ''۔ (البقرہ: ۱۴۳، کنزالایمان)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں، ''نبی کریم ﷺ کو شہید (حاضر وناظر) اسلیے کہا گیا ہے کیونکہ آپ اپنے نورِ نبوت سے ہر دیندار کے درجے کو جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کے ایمان کی حقیقت کیا ہے اور کون سا حجاب اسکی ترقی میں رکاوٹ ہے۔ پس حضور ﷺ تمہارے گناہوں کو، تمہارے ایمان کے درجات کو، تمہارے نیک وبد اعمال کو اور تمہارے اخلاص ونفاق کو اچھی طرح جانتے ہیں''۔ (تفسیر عزیزی)

حیات النبی ﷺ، احادیث کی روشنی میں:

☆ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ کا ارشاد ہے،

''جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود بھیجا کرو کیونکہ اس دن فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور جو بھی درود پڑھے اسکا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے''۔ صحابہ کرام نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ کیا آپکے وصال کے بعد بھی؟ ارشاد فرمایا، ''ہاں وصال کے بعد بھی۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام فرمادیا ہے کہ وہ انبیاء کے جسموں کو کھائے۔ پس اللہ تعالیٰ کا ہر نبی زندہ ہے اور اسے رزق دیا جاتا ہے''۔ (ابن ماجہ، مشکوٰۃ باب الجمعہ)

☆ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے،

''جب کوئی مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ میری روح کو مجھ پر لوٹا دیتا ہے (یعنی میری روح کی توجہ سلام بھیجنے والے کی طرف ہوجاتی ہے) اور میں اسے اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں''۔ (مسند احمد، ابوداؤد، بیہقی فی شعب الایمان)

☆ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے رویت ہے کہ آقا ومولیٰ ﷺ نے فرمایا،

''اللہ تعالیٰ نے میرے لیے دنیا کو ظاہر فرمادیا پس میں دنیا کو اور جو کچھ اس میں قیامت تک ہونے والا ہے، سب کچھ اس طرح دیکھ رہا ہوں جیسے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو دیکھ رہا ہوں''۔ (طبرانی، ابونعیم، زرقانی)

☆ رسول اکرم ﷺ کی بارگاہ میں عرض کی گئی، یارسول اللہ ﷺ! جو لوگ یہاں نہیں ہیں اور آپ پر درود پڑھتے ہیں اور جو لوگ آپکے وصال کے بعد آئیں گے، انکے درود پڑھنے کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟ ارشاد ہوا،

''محبت والوں کا درود میں خود سنتا ہوں اور انہیں پہچانتا بھی ہوں اور دوسرے لوگوں کا درود میرے دربار میں پیش کیا جاتا ہے''۔ (دلائل الخیرات ص ۶۳ مطبوعہ تاج کمپنی)

☆ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آقائے دوجہاں ﷺ نے فرمایا، جمعہ کے دن مجھ پر زیادہ درود پڑھا کرو کیونکہ وہ یوم مشہود ہے اس دن فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ کوئی بندہ جہاں بھی درود پڑھتا ہے اسکی آواز مجھ تک پہنچ جاتی ہے۔ ہم نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! کیا آپکے وصال کے بعد بھی؟ ارشاد فرمایا، ''ہاں میرے وصال کے بعد بھی کیونکہ بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کردیا ہے کہ وہ انبیاء کرام کے جسموں کو کھائے''۔

اس حدیث کو حافظ منذری رحمۃ اللہ علیہ نے الترغیب میں ذکر کیا اور فرمایا کہ ابن ماجہ نے اسے سند جید کے ساتھ روایت کیا۔ (طبرانی، جلاء الافہام لابن قیم ص ۶۳)

☆ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکارِ دوعالم ﷺ نے فرمایا،

''اللہ تعالیٰ نے میری قبر پر ایک فرشتہ مقرر کیا ہے جس کو ساری مخلوق کی باتیں سننے کی قدرت عطا فرمائی ہے۔ پس جو شخص بھی مجھ پر قیامت تک درود بھیجے گا وہ فرشتہ مجھ کو اسکا نام اور اسکے باپ کا نام لے کر درود پہنچاتا رہے گا کہ فلاں بن فلاں نے آپ پر درود بھیجا ہے''۔

(طبرانی فی الکبیر، ابن حبان، القول البدیع، فضائل درود ص ۱۹)

غور فرمایئے کہ جب ایک فرشتے میں اتنی طاقت ہے کہ وہ ساری مخلوق کی آوازیں سنتا ہے اور انکے نام مع ولدیت جانتا ہے تو حبیب کبریا، عبدِ مصطفیٰ ﷺ کا کیا اعلیٰ مقام ہو گا!

اعلیٰ حضرت محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمایا،

دور و نزدیک کے سننے والے وہ کان　　کانِ لعلِ کرامت پہ لاکھوں سلام

ان احادیثِ مبارکہ سے ثابت ہوا کہ:-

۱۔ آقا و مولیٰ ﷺ اپنے روضہ اطہر میں حیاتِ جسمانی حقیقی کے ساتھ زندہ ہیں۔

۲۔ سیدُ الانبیاء ﷺ اور دیگر انبیاء زندہ ہیں، رزق پاتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں۔

۳۔ آپ کا ایک خادم فرشتہ ساری مخلوق کا درود سنتا ہے اور سب کے نام جانتا ہے۔

۴۔ جو بھی آپ پر درود و سلام پڑھے آپ خود بھی سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں۔

۵۔ حضور ﷺ ساری کائنات کو اپنی مبارک ہتھیلی کی طرح ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

صحابہ کرام اور ائمہ دین کا عقیدہ:

☆ صحابہ کرام کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ آقا و مولیٰ ﷺ وصالِ ظاہری کے بعد روضہ اطہر میں زندہ ہیں۔ اسلیے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے وصال سے قبل یہ وصیت فرمائی کہ میرا جنازہ حضور ﷺ کے حجرہ مبارک کے سامنے رکھ دینا اور اجازت طلب کرنا۔ اگر دروازہ کھل جائے اور اجازت مل جائے تو مجھے حجرہ مبارک کے اندر دفن کرنا ورنہ عام قبرستان میں دفن کر دینا۔ صحابہ کرام نے ایسا ہی کیا۔ جب آپکا جنازہ روضہ اقدس کے سامنے رکھا گیا تو دروازہ کھل گیا اور روضہ اقدس سے آواز آئی ''دوست کو دوست کے پاس لے آؤ''۔

(تفسیر کبیر ج ۵ ص ۶۸۵، خصائص کبریٰ ج ۲ ص ۲۸۲)

☆ سید احمد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ ۵۵۵ھ میں حج کے بعد زیارت کے لیے حاضر ہوئے تو روضہ اقدس کے سامنے دو شعر پڑھے جسکا ترجمہ یہ ہے ''میں دُوری کی حالت میں اپنی روح کو خدمت اقدس میں بھیجا کرتا تھا اور وہ میری نائب بن کر آستانہ مبارکہ چوما کرتی تھی۔ اب جسم کی حاضری کا وقت آیا ہے میرے آقا! آپ اپنا دستِ مبارک عطا فرمائیں تاکہ میرے ہونٹ اسے بوسہ دیں''۔

اس عرض پر نبی کریم ﷺ نے اپنا دستِ اقدس باہر نکالا جسے سید احمد رفاعی رحمہ اللہ نے بوسہ دیا۔ یہ واقعہ دیوبندی عالم مولوی زکریا کاندھلوی نے بھی اپنی کتاب فضائلِ حج میں صفحہ ۱۸۴ پر الحاوی للفتاوی سے نقل کیا اور لکھا کہ اس وقت مسجد نبوی میں نوے ہزار کا مجمع تھا جنہوں نے اس واقعہ کو دیکھا۔ ان میں محبوبِ سبحانی قطبِ ربانی شیخ عبدالقادر جیلانی نور اللہ مرقدہ کا نام نامی بھی ذکر کیا جاتا ہے۔

☆ امام تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ (م:۷۵۶ھ) فرماتے ہیں،

''قرآن کریم سے اگر شہداء کی حیات ثابت ہے تو کئی وجوہ سے رسول کریم ﷺ کی حیات بھی ثابت ہے۔ ایک تو یہ کہ رسول کریم ﷺ کا رتبہ ہر شہید اور ہر شخص سے بڑھ کر ہے اور تمام انبیاء کرام کا مرتبہ تمام شہیدوں سے بڑھ کر ہے۔ جب شہیدوں کو اللہ تعالیٰ یہ رتبہ دیتا ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ رسولِ اکرم ﷺ اور دیگر انبیاء کرام کو اس رتبہ سے محروم کرے۔ لہٰذا انبیاء کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں''۔ (شفاءُ السقام ص ۲۳۵)

☆ شارح بخاری امام قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ (م:۹۱۱ھ) فرماتے ہیں، ''ہمارے علماء نے فرمایا ہے کہ آقا و مولیٰ ﷺ کی حیات اور وفات میں کوئی فرق نہیں۔ آپ اپنی امت کو دیکھ رہے ہیں، انکی حالتوں، نیتوں، ارادوں اور دل کی باتوں کو بھی جانتے ہیں اور یہ سب امور آپ پر روشن ہیں اور اس میں کوئی شے مخفی نہیں''۔ (مواہب الدنیہ ج ۲ ص ۳۸۷)

☆ امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کثیر احادیث لکھ کر فرماتے ہیں،

''ان احادیث و روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اپنے جسم اقدس اور روح مبارک کے ساتھ وصال ظاہری کے بعد زندہ ہیں۔ آپ تصرف فرماتے ہیں اور زمین و آسمان میں جہاں چاہتے ہیں تشریف لے جاتے ہیں۔ آپ وصال کے بعد ہماری آنکھوں سے اس طرح پوشیدہ ہیں جیسے فرشتے اجسام کے ساتھ زندہ ہونے کے باوجود ہماری آنکھوں سے پوشیدہ ہیں''۔ (الحاوی للفتاوی ج ۲ ص ۲۶۵)

☆ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (م:۱۰۵۲ھ) فرماتے ہیں،

''علمائے امت کے کثیر اختلاف کے باوجود اس مسئلہ میں کسی کا اختلاف نہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ وصال کے بعد بھی حقیقی جسمانی حیات کے ساتھ زندہ ہیں۔ آپ کی زندگی میں مجاز و تاویل کا وہم نہیں ہے۔ آپ اپنی امت کے احوال پر حاضر و ناظر ہیں۔ جو طالبانِ حقیقت آپکی طرف متوجہ ہوتے ہیں آپ ان سب کو فیض پہنچاتے ہیں اور انکی

تربیت کرتے ہیں"۔(سلوک اقرب السبل ص ۱۶۱)

الحمدللہ! سرکاردوعالم ﷺ کی حیات اور آپ کے حاضروناظر ہونے سے متعلق ہر دور میں اہل سنت وجماعت کے یہی عقائد رہے ہیں اور یہی صراطِ مستقیم ہے۔

ندائے یارسول اللہ ﷺ:

صحابہ کرام اور صالحین حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لیے آقا ومولیٰ ﷺ کی بارگاہِ بیکس پناہ میں حاضر ہوکر فریاد کیا کرتے اور جو دوری کے باعث حاضر نہ ہوسکتے وہ دور ہی سے آقا ﷺ کو ندا کرکے رحمت طلب کیا کرتے، صالحین کا آج تک یہی معمول چلا آرہا ہے۔

☆ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے وصال کے تین دن بعد ایک اعرابی آیا اور روضہ اطہر پر حاضر ہوکر اپنے سر پر خاک ڈالنے لگا اور یوں عرض کرنے لگا، یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے جو اللہ کا کلام ہمیں پہنچایا اس میں یہ آیت بھی ہے، (پھر اس نے سورہ نساء کی آیت ۶۴ تلاوت کی جس کا ترجمہ یہ ہے) "اور اگر وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں تو اے محبوب ﷺ! تمہارے حضور حاضر ہوں پھر اللہ سے معافی چاہیں اور رسول بھی انکی شفاعت فرمائے تو ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں"۔ پھر اس نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے یعنی گناہ کیے ہیں، اب آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں تا کہ آپ میری مغفرت فرمائیں۔ روضہ اقدس سے آواز آئی، قد غفر لك۔ اے اعرابی! تجھے بخش دیا گیا۔

(تفسیر قرطبی ج ۵ ص ۲۶۵، تفسیر مدارک التنزیل)

☆ گزشتہ صفحات میں وہ معروف حدیث بیان ہوچکی جس میں خلافتِ عثمانی میں ایک شخص کو (جو صحابی یا تابعی تھے)، حضرت عثمان بن حنیف رضی اللہ عنہ نے دعائے حاجت سکھائی جس سے ان کی حاجت پوری ہوگئی۔ اس دعائے حاجت میں "یارسول اللہ ﷺ" پکارنے کی تعلیم دی گئی ہے جبکہ یہ دعا خود سرکار دوعالم ﷺ نے سکھائی تھی۔ گویا "ندائے یارسول اللہ ﷺ" آقا ومولیٰ ﷺ کے حکم کی تعمیل اور صحابہ کرام کی سنت ہے۔

☆ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا پاؤں سوگیا۔ کسی نے کہا، انہیں یاد کیجیے جو آپ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں۔ انہوں نے باآوازِ بلند کہا، یا محمداہ ﷺ۔ تو ان کا پاؤں فوراً صحیح ہوگیا۔ (الادب المفرد ص ۲۵۰)

اس کی شرح میں محدث علی قاری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں، "حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بلند آواز سے ندا کی، اس سے انکا مقصد یہ تھا کہ محبوب سے محبت بھی ظاہر کی جائے اور ان سے مدد کی التجا بھی ہوجائے"۔ (شرح شفا)

☆ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی محفل میں کسی آدمی کا پاؤں سوگیا تو آپ نے اسے فرمایا، اس کو یاد کرو جو تمہیں سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اس نے کہا، یا محمداہ ﷺ! اسی وقت اس کا پاؤں اچھا ہوگیا۔ (کتاب الاذکار ص ۱۳۵)

☆ علامہ شہاب الدین خفاجی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، "حضرت ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کے علاوہ اور حضرات سے بھی ایسا ہی مروی ہے بلکہ اہلِ مدینہ میں ایسا کہنے یعنی یا محمداہ ﷺ پکارنے کا رواج عام تھا"۔ (نسیم الریاض شرح شفاءِ عیاض ج ۳ ص ۳۵۵)

☆ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ صحابہ کرام کے ہمراہ جب مسیلمہ کذاب کے لشکر سے برسرِ پیکار تھے، نہایت گھسان کا معرکہ تھا، اسوقت سب مسلمانوں کی زبان پر یہ ندا تھی، یا محمداہ یا محمداہ ﷺ! یارسول اللہ ﷺ! مدد فرمائیے۔ یارسول اللہ ﷺ! مدد فرمائیے۔ پھر مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔

(البدایہ والنہایہ ج ۶ ص ۳۲۴، تاریخ کامل ج ۲ ص ۱۵۲، تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۵۰)

☆ حضرت کعب بن ضمرہ رضی اللہ عنہ اسلامی لشکر کے ساتھ جب شام کے شہر حلب کی فتح کے لیے لڑ رہے تھے اور دشمن کے ساتھ سخت مقابلہ ہو رہا تھا تو آپ کی زبان پر یہ ندا تھی، یا محمد یا محمد یا نصر اللہ انزل۔ یارسول اللہ ﷺ! کرم فرمائیے، اے اللہ کی مدد نازل ہو۔ تھوڑی دیر بعد مسلمانوں کو دشمن پر فتح حاصل ہوئی۔ (فتوح الشام ج ۱ ص ۱۹۲)

خیال رہے کہ یہ جنگ اسوقت ہوئی جب حضور اکرم ﷺ کا وصال ہوچکا تھا۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کے وصال کے بعد بھی صحابہ کرام مشکل وقت میں "ندائے یا رسول اللہ ﷺ" کے ذریعے اپنے آقا ومولیٰ ﷺ سے توسل کرتے تھے۔

شیخ شرف الدین بوصیری رحمۃ اللہ علیہ یوں فریاد کرتے ہیں،

يَـا أَكْـرَمَ الْـخَـلْـقِ مَـالِـىْ مَنْ أَلُـوْذُ بِـهٖ
سِـوَاكَ عِـنْـدَ حُـلُـوْلِ الْـحَـادِثِ الْـعَـمِـمِ

"اے بہترین مخلوق ﷺ! آپ کے سوا میرا کوئی نہیں کہ آفت ومصیبت کے وقت میں جس کی پناہ لوں، اس لیے کرم فرمائیے"۔ (قصیدہ بُردہ شریف)

ان دلائل سے واضح ہوگیا کہ یارسول اللہ ﷺ پکارنا صحابہ کرام اور تابعین سے لیکر آج تک ساری امت کا معمول رہا ہے۔ اگر حضور ﷺ کو حرف "یا" کے ساتھ مخاطب کرنا شرک ہوتو پھر سارے نمازی مشرک قرار پائیں گے (معاذ اللہ) جو ہر نماز میں "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِىُّ" پڑھتے ہیں جس میں نبی کریم ﷺ کو مخاطب کرکے سلام عرض کیا جاتا ہے۔ ماننا پڑے گا کہ جب السلام علیک ایھا النبی (اے نبی آپ پر سلام ہو) نماز میں پڑھنا واجب ہے تو نماز کے باہر ہرگز شرک نہیں ہوسکتا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، ''یہ خطاب اسلیے ہے کہ حقیقت محمدیہ ﷺ موجودات کے ذرے ذرے میں اور ممکنات کے ہر فرد میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ پس نور کبریا ﷺ ہر نمازی کی ذات میں موجود و حاضر ہیں۔ نمازیوں کو چاہیے کہ اس حقیقت سے آگاہ رہیں''۔ (اشعۃ اللمعات کتاب الصلوٰۃ)

بانی دارالعلوم دیوبند، مولوی قاسم نانوتوی آقا و مولیٰ ﷺ کو یوں مدد کے لیے پکارتے ہیں،

مدد کر اے کرمِ احمدی کہ تیرے سوا نہیں ہے قاسمِ بیکس کا کوئی حامی کار

(قصائد قاسمی ص ٦)

دیوبند کے پیشوا مولوی اشرفعلی تھانوی بارگاہِ نبوی میں یوں فریاد کرتے ہیں،

دستگیری کیجئے میرے نبی کشمکش میں تم ہی ہو میرے ولی

ابنِ عبداللہ ! زمانہ ہے خلاف اے مرے مولا ! خبر لیجئے مری

(نشرُ الطیب ص ١٨٦)

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ :

''راستہ اُن کا جن پر تو نے انعام واحسان کیا'' اس سے یہ بات بھی واضح ہو رہی ہے کہ جن امور پر بزرگانِ دین اور نیک بندوں کا عمل رہا ہو، وہ صراطِ مستقیم میں داخل ہیں۔ نیز موطا امام محمد میں ہے، ''جس کام کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے''۔

شعائرِ اہلِ سنت مثلاً محفلِ میلادُ النبی ﷺ، کھڑے ہو کر درود وسلام پڑھنا، اذان سے قبل و بعد میں درود وسلام پڑھنا، اذان میں حضور ﷺ کا نام اقدس سن کر انگوٹھے چومنا، ایصالِ ثواب و فاتحہ، اولیاء کرام کے عرس منعقد کرنا اور گیارھویں شریف، یہ سب وہ امور ہیں جن پر صدیوں سے عرب وعجم کے علماء ومشائخ کا عمل ہے اور ان سب امور کی اصل قرآن وسنت میں موجود ہے لہٰذا ان کاموں کو جائز ومستحب سمجھنا ہی صراطِ مستقیم ہے۔ یہاں مختصراً بعض امور کا ذکر کیا جا رہا ہے، تفصیل جاننے کے لیے فقیر کی کتاب **''خواتین اور دینی مسائل''** ملاحظہ فرمائیں۔

پہلے تو یہ سمجھ لیجیے کہ بدعت کسے کہتے ہیں؟ بدعت کے لغوی معنی ''نئی چیز ایجاد کرنے'' کے ہیں۔ شرعی اصطلاح میں ہر وہ بات جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ اقدس کے بعد پیدا ہو، بدعت ہے۔ صدرُ الشریعہ بدعت کی اقسام کے متعلق فرماتے ہیں، بدعتِ مذمومہ وقبیحہ (یعنی بری بدعت) وہ ہے جو کسی سنت کے مخالف ومزاحم ہو اور یہ مکروہ یا حرام ہے۔ مطلق بدعت تو مستحب بلکہ سنت بلکہ واجب تک ہوتی ہے۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تراویح کی نسبت فرماتے ہیں، نعمتِ البدعۃُ ھٰذہٖ (صحیح مسلم) یہ اچھی بدعت ہے حالانکہ تراویح سنتِ مؤکدہ ہے۔ جس کام کی اصل شرع شریف سے ثابت ہو وہ ہر گز بدعتِ قبیحہ نہیں ہو سکتا۔ (بہارِ شریعت حصہ اول ص ٥١)

اپنے دل کی خوشی سے کوئی کام کرنا ''تطوّع'' کہلاتا ہے اسے فقہی اصطلاح میں مستحب کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس بارے میں ارشاد ہوا، ''جو کوئی اپنی خوشی سے کرے کچھ نیکی، تو اللہ قدر دان ہے سب کچھ جاننے والا''۔ (البقرہ: ١٥٨) دوسری جگہ فرمایا گیا، ''پھر جو خوشی سے کرے نیکی تو اچھا ہے اسکے واسطے''۔ (البقرہ: ١٨٤، کنز الایمان)

ان آیاتِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ مومن اپنی خوشی سے کوئی بھی اچھا کام اختیار کر سکتا ہے خواہ وہ کام نیا ہی کیوں نہ ہو؛ اس پر احادیثِ صحیحہ بھی گواہ ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہوا، ''اور راہب بننا، تو یہ بات انہوں نے دین میں اپنی طرف سے نکالی، ہم نے ان پر مقرر نہ کی تھی، ہاں یہ بدعت انہوں نے اللہ کی رضا چاہنے کو پیدا کی پھر اسے نہ نباہا جیسا کہ اسکے نباہنے کا حق تھا، تو انکے ایمان والوں کو ہم نے ان کا ثواب عطا کیا''۔

(الحدید: ٢٧، کنز الایمان)

اس کی تفسیر میں صدرُ الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی قدس سرہٗ فرماتے ہیں، اس آیت سے معلوم ہوا کہ بدعت یعنی دین میں کسی بات کا نکالنا اگر وہ بات نیک ہو اور اس سے رضائے الٰہی مقصود ہو تو بہتر ہے، اس پر ثواب ملتا ہے اور اسکو جاری رکھنا چاہیے، ایسی بدعت کو بدعتِ حسنہ کہتے ہیں۔ البتہ دین میں بری بات نکالنا بدعتِ سیئہ کہلاتا ہے وہ ممنوع اور ناجائز ہے۔ بدعتِ سیئہ حدیث شریف میں وہ بتائی گئی ہے جو خلافِ سنت ہو، اسکے نکالنے سے کوئی سنت اٹھ جائے۔ (خزائن العرفان)

اگر بدعاتِ حسنہ اور سیئہ کا فرق نہ کیا جائے تو موجودہ دور کے بیشتر کام جو ثواب سمجھ کر کیے جاتے ہیں معاذ اللہ حرام ہو جائیں گے حالانکہ محفلِ میلاد اور گیارھویں شریف کو بدعت وحرام کہنے والے خود ان کاموں کو ثواب کا باعث سمجھتے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم کے الفاظ پر اعراب ڈالنا، تیس پاروں میں تقسیم کرنا، اسکے مختلف زبانوں میں ترجمے کرنا، گاڑیوں اور جہازوں کے ذریعے حج کا سفر کرنا اور اسکے لیے پاسپورٹ ویزا جاری کرانا، تفسیر وحدیث اور فقہ کی کتابیں، دارالعلوم کا نصاب، نماز یا دینی علوم پڑھانے کی تنخواہ لینا، طلبہ کا امتحان لینا، تقسیمِ اسناد کا جلسہ، مساجد میں محراب وگنبد اور مینار بنانا، ماربل کے فرش اور قالین بچھانا، بجلی کے پنکھے، لائٹیں، گیزر لگانا بیشمار ایسے کام ایسے ہیں جنہیں منکرین کارِ ثواب سمجھ کر نہ صرف خود کرتے ہیں بلکہ ان ''بدعتوں'' کے لیے چندے کی اپیلیں بھی کرتے ہیں۔

عیدِ میلادُ النبی ﷺ:

بارہ ربیع الاول کو آقائے دو جہاں ﷺ کی ولادتِ باسعادت کی خوشی میں پورے عالمِ اسلام میں محافلِ میلاد منعقد کی جاتی ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کا میلاد منانا جائز و مستحب ہے اور اس کی اصل قرآن وسنت سے ثابت ہے۔

ارشادِ باری تعالٰی ہوا، ''اور انہیں اللہ کے دن یاد دلاؤ''۔ (ابراھیم:۵)

امام المفسرین سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک ایامُ اللہ سے مراد وہ دن ہیں جن میں رب تعالٰی کی کسی نعمت کا نزول ہوا ہو۔ ''ان ایام میں سب سے بڑی نعمت کے دن سید عالم ﷺ کی ولادت و معراج کے دن ہیں، ان کی یاد قائم کرنا بھی اس آیت کے حکم میں داخل ہے''۔ (تفسیر خزائن العرفان)

بلاشبہ اللہ تعالٰی کی سب سے عظیم نعمت نبی کریم ﷺ کی ذاتِ مقدسہ ہے۔

ارشاد ہوا، ''بیشک اللہ کا بڑا احسان ہوا مسلمانوں پر کہ ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا''۔ (ال عمران:۱۶۴) آقا و مولٰی ﷺ تو وہ عظیم نعمت ہیں کہ جن کے ملنے پر رب تعالٰی نے خوشیاں منانے کا حکم بھی دیا ہے۔ ارشاد ہوا، ''(اے حبیب!) تم فرماؤ (یہ) اللہ ہی کے فضل اور اسی کی رحمت (سے ہے) اور اسی پر چاہیے کہ خوشی کریں، وہ (خوشی منانا) انکے سب دھن دولت سے بہتر ہے''۔ (یونس:۵۸)

خلاصہ یہ ہے کہ عیدِ میلاد منانا لوگوں کو اللہ تعالٰی کے دن یاد دلانا بھی ہے اور اس نعمت کے ملنے کی خوشی منانا بھی۔ اگر ایمان کی نظر سے قرآن و حدیث کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ذکرِ میلادِ مصطفٰے ﷺ اللہ تعالٰی کی سنت بھی ہے اور رسولِ کریم ﷺ کی سنت بھی۔

سورہ ال عمران کی آیت ۸۱ ملاحظہ کیجیے۔ رب ذوالجلال نے کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام کی محفل میں اپنے حبیب لبیب ﷺ کی آمد اور فضائل کا ذکر فرمایا۔ گویا یہ سب سے پہلی محفلِ میلاد تھی جسے اللہ تعالٰی نے منعقد فرمایا اور اس محفل کے شرکاء صرف انبیاء کرام علیہم السلام تھے۔ حضور ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری اور فضائل کا ذکر قرآن کریم کی متعدد آیاتِ کریمہ میں موجود ہے۔

رسولِ معظم ﷺ کے مبارک زمانہ کی چند محافلِ میلاد کا ذکر ملاحظہ فرمائیے۔

آقا و مولٰی ﷺ نے خود مسجد نبوی میں منبر شریف پر اپنا ذکرِ ولادت فرمایا۔ (جامع ترمذی ج ۲ ص ۲۰۱) آپ نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے لیے منبر پر چادر بچھائی اور انہوں نے منبر پر بیٹھ کر نعت شریف پڑھی، پھر آپ نے انکے لیے دعا فرمائی۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۶۵) حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے غزوہ تبوک سے واپسی پر بارگاہِ رسالت میں ذکرِ میلاد پر مبنی اشعار پیش کیے۔ (اسدُ الغابہ ج ۲ ص ۱۲۹)

اسی طرح حضرات کعب بن زہیر، سواد بن قارب، عبد اللہ بن رواحہ، کعب بن مالک و دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نعتیں کتب احادیث و سیرت میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

بعض لوگ یہ وسوسہ اندازی کرتے ہیں کہ اسلام میں صرف دو عیدیں ہیں لہٰذا تیسری عید حرام ہے (معاذ اللہ)۔ اس نظریہ کے باطل ہونے کے متعلق قرآن کریم سے دلیل لیجیے۔ ارشادِ باری تعالٰی ہے، ''عیسٰی بن مریم نے عرض کی، اے اللہ! اے ہمارے رب! ہم پر آسمان سے ایک (کھانے کا) خوان اتار کہ وہ ہمارے لیے عید ہو ہمارے اگلوں پچھلوں کی''۔ (المائدہ:۱۱۴، کنز الایمان)

صدرُ الافاضل فرماتے ہیں، ''یعنی ہم اسکے نزول کے دن کو عید بنائیں، اسکی تعظیم کریں، خوشیاں منائیں، تیری عبادت کریں، شکر بجالائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس روز اللہ تعالٰی کی خاص رحمت نازل ہو اس دن کو عید بنانا اور خوشیاں منانا، عبادتیں کرنا اور شکر بجالانا صالحین کا طریقہ ہے اور کچھ شک نہیں کہ سیدِ عالم ﷺ کی تشریف آوری اللہ تعالٰی کی عظیم ترین نعمت اور بزرگ ترین رحمت ہے اسلیے حضور ﷺ کی ولادتِ مبارکہ کے دن عید منانا اور میلاد شریف پڑھ کر شکرِ الٰہی بجالانا اور اظہارِ فرح اور سُرور کرنا مستحسن و محمود اور اللہ کے مقبول بندوں کا طریقہ ہے''۔ (تفسیر خزائن العرفان)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ تلاوت فرمائی تو ایک یہودی نے کہا، اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید مناتے۔ اس پر آپ نے فرمایا، یہ آیت جس دن نازل ہوئی اس دن دو عیدیں تھیں؛ عیدِ جمعہ اور عیدِ عرفہ۔ (ترمذی)

پس قرآن و حدیث سے ثابت ہوگیا کہ جس دن کوئی خاص نعمت نازل ہو اس دن عید منانا جائز بلکہ اللہ تعالٰی کے مقرب نبی حضرت عیسٰی علیہ السلام اور صحابہ کرام علیہم الرضوان کی سنت ہے۔ چونکہ عید الفطر اور عید الاضحٰی حضور ﷺ ہی کے صدقے میں ملی ہیں اسلیے آپ کا یومِ میلاد بدرجۂ اولٰی عید قرار پایا۔

اب چند تاریخی حوالہ جات پیشِ خدمت ہیں جن سے ثابت ہوجائے گا کہ محافلِ میلاد کا سلسلہ عالمِ اسلام میں ہمیشہ سے جاری ہے۔

محدث ابن جوزی رحمہ اللہ (متوفی ۵۹۷ ھ) فرماتے ہیں، '' مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ، یمن، مصر، شام اور تمام عالمِ اسلام کے لوگ مشرق سے مغرب تک ہمیشہ سے حضور اکرم ﷺ کی ولادتِ باسعادت کے موقع پر محافلِ میلاد کا انعقاد کرتے چلے آرہے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہتمام آپ ﷺ کی ولادت کے تذکرے کا کیا جاتا ہے اور مسلمان ان محافل کے ذریعے اجرِ عظیم اور بڑی روحانی کامیابی پاتے ہیں''۔ (المیلاد النبوی ص ۵۸)

امام جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ (م ۹۱۱ ھ) فرماتے ہیں، ''میرے نزدیک میلاد کے لیے اجتماع تلاوتِ قرآن، حیاتِ طیبہ کے واقعات اور میلاد کے وقت ظاہر ہونے والی علامات کا تذکرہ ان بدعاتِ حسنہ میں سے ہے جن پر ثواب ملتا ہے کیونکہ اسمیں حضور ﷺ کی تعظیم اور آپ کی ولادت پر خوشی کا اظہار ہوتا ہے''۔ (حسن المقصد، الحاوی للفتاوی ج ا ص ۱۸۹)

امام قسطلانی شارح بخاری رحمہ اللہ (م ۹۲۳ ھ) فرماتے ہیں، ''ربیع الاول میں تمام اہلِ اسلام ہمیشہ سے میلاد کی خوشی میں محافل منعقد کرتے رہے ہیں۔ محفلِ میلاد کی یہ برکت مجرب ہے کہ اسکی وجہ سے سارا سال امن سے گزرتا ہے اور ہر مراد جلد پوری ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحمتیں نازل فرمائے جس نے ماہِ میلاد کی ہر رات کو عید بنا کر ایسے شخص پر شدت کی جس کے دل میں مرض و عناد ہے''۔ (مواہب الدنیہ ج ا ص ۲۷)

شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی رحمہ اللہ (والد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ: م ۱۱۷۶ ھ) فرماتے ہیں کہ میں ہر سال میلاد شریف کے دنوں میں کھانا پکوا کر لوگوں کو کھلایا کرتا تھا۔ ایک سال قحط کی وجہ سے بھنے ہوئے چنوں کے سوا کچھ میسر نہ ہوا، میں نے وہی چنے تقسیم کر دیے۔ رات کو خواب میں آقا و مولیٰ ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوا تو دیکھا کہ وہی بھنے ہوئے چنے سرکارِ دو عالم ﷺ کے سامنے رکھے ہوئے ہیں اور آپ بیحد خوش اور مسرور ہیں۔ (الدر الثمین ص ۸)

ان دلائل و براہین سے ثابت ہو گیا کہ میلاد النبی ﷺ کی محافل منعقد کرنے اور میلاد کا جشن منانے کا سلسلہ امتِ مسلمہ میں صدیوں سے جاری ہے اور یہی صراطِ مستقیم ہے۔ اسے بدعت و حرام کہنے والے دراصل خود بدعتی و گمراہ ہیں۔

کھڑے ہو کر درود و سلام پڑھنا:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے، ''بیشک اللہ اور اسکے فرشتے درود بھیجتے ہیں اس غیب بتانے والے پر، اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود اور خوب سلام بھیجو''۔ (الاحزاب: ۵۶)

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور اسکے فرشتے، حبیبِ کبریا ﷺ پر درود بھیج رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو بیٹھنے یا کھڑے ہونے سے پاک ہے کیونکہ یہ مخلوق کی صفات ہیں البتہ بعض فرشتوں کے متعلق قرآن میں مذکور ہے کہ وہ صفیں بنا کر کھڑے ہیں۔ (سورۃ الصّٰفّٰت: ۱) اور سب فرشتے درود بھیج رہے ہیں غیب بتانے والے آقا ﷺ پر۔ صحابہ کرام علیہم الرضوان سے لے کر آج تک تمام مسلمان مواجہ اقدس میں کھڑے ہو کر ہی درود و سلام پیش کرتے آئے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ کھڑے ہو کر درود و سلام پیش کرنا بعض ملائکہ کی سنت بھی ہے نیز صحابہ کرام اور تمام زائرینِ بارگاہِ نبوی کا طریقہ بھی یہی ہے۔

اس آیت مبارکہ میں کسی خاص وقت یا کسی مخصوص حالت کا ذکر نہ فرمایا گیا بلکہ مطلق حکم دیا گیا تا کہ درود و سلام پڑھنا ہر وقت اور ہر حالت میں جائز قرار پائے ماسوائے اسکے کہ بعض اوقات و مواقع کی ممانعت کا شریعت حکم صادر کرے۔ پس شرعاً ممنوع مواقع کے علاوہ جس وقت اور جس حالت میں درود و سلام پڑھا جائے مذکورہ حکمِ الٰہی کی تعمیل ہوتی ہے۔

مجددِ دین و ملت اعلیٰ حضرت محدث بریلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب کسی بات کو شرع نے پسندیدہ کہا ہے تو جس جگہ، جس وقت اور جس طرح وہ بات واقع ہو گی ہمیشہ پسندیدہ رہے گی جب تک کہ کسی خاص صورت کی ممانعت شریعت سے نہ آ جائے۔ مثلاً ذکرِ الٰہی کی خوبی اور اچھائی قرآن و حدیث سے ثابت ہے تو جب کہیں کسی طور خدا کا ذکر کیا جائے گا بہتر ہی ہوگا، ہر ہر حالت کا ثبوت شرع سے ضروری نہیں مگر بیت الخلاء میں بیٹھ کر زبان سے ذکرِ الٰہی کرنا ممنوع ہے کیونکہ اس خاص صورت کی برائی شرع سے ثابت ہے۔ غرض یہ کہ جس مطلق بات کی خوبی معلوم ہو اسکی خاص خاص صورتوں کی جدا جدا خوبی ثابت کرنا ضروری نہیں کیونکہ وہ تمام صورتیں اسی مطلق بات کی ہیں جس کی خوبی ثابت ہو چکی، البتہ کسی خاص صورت کو ناجائز و برا بتانے کے لیے دلیل لانی ہوگی۔

علامہ علی بن برہان الدین حلبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نورِ مجسم ﷺ کے ذکر کے وقت قیام کرنا جلیل القدر محدث امام تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ (م ۷۵۶ ھ) سے ثابت ہے اور اس قیام پر انکے ہم عصر مشائخِ اسلام نے انکی پیروی کی۔ امام سبکی کے پاس جید علماء و مشائخ کا عظیم اجتماع تھا، اس محفل میں کسی نے امام صرصری کے نعتیہ اشعار پڑھے جنکا ترجمہ یہ ہے، ''اگر بہترین کاتب چاندی کی تختی پر سونے کے پانی سے حضورِ اکرم ﷺ کی تعریف لکھے پھر بھی کم ہے، بیشک عزت و شرف والے لوگ آقا و مولیٰ ﷺ کا ذکرِ جمیل سن کر صف بستہ قیام کرتے ہیں یا گھٹنوں کے بل کھڑے ہو جاتے ہیں''۔ یہ اشعار سن کر امام سبکی اور تمام علماء و مشائخ کھڑے ہو گئے، اسوقت بہت سرور اور سکون حاصل ہوا۔

(سیرتِ حلبیہ ج ا ص ۸۰، طبقات الکبریٰ ج ا ص ۲۰۸)

امام المحدثین شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ (م ۱۰۵۶ ھ) فرماتے ہیں،

''اے اللہ! میرا کوئی عمل ایسا نہیں ہے جسے تیری بارگاہ میں پیش کرنے کے لائق سمجھوں، میرے تمام اعمال میں فسادِ نیت کا خدشہ رہتا ہے البتہ مجھ حقیر فقیر کا ایک عمل صرف تیری ذات پاک کی عنایت کی وجہ سے نہایت شاندار ہے اور وہ یہ ہے کہ میں محفلِ میلاد میں کھڑے ہو کر سلام پڑھتا ہوں اور نہایت عاجزی اور محبت و خلوص سے تیرے حبیب ﷺ پر درود بھیجتا ہوں۔ اے اللہ! وہ کون سا مقام ہے جہاں میلادِ مبارک سے زیادہ تیری برکت نازل ہوتی ہے اسلیے اے ارحم الراحمین! مجھے کامل یقین ہے کہ میرا یہ

عمل کبھی ضائع نہ جائے گا بلکہ تیری بارگاہ میں یقیناً قبول ہوگا؛ جو کوئی درود و سلام پڑھے اور اسکے وسیلے سے دعا کرے وہ کبھی مسترد نہیں ہو سکتی۔ (اخبار الاخیار ص ۲۲۱)

اب آخر میں قیام و سلام کو بدعت کہنے والے اپنے اکابرین کے پیر و مرشد حاجی امداد اللہ مہاجر مکی صاحب کا فرمان بھی سن لیں۔ وہ فرماتے ہیں، ''مشربِ فقیر کا یہ ہے کہ محفلِ میلاد میں شریک ہوتا ہوں بلکہ ذریعہ برکات سمجھ کر ہر سال منعقد کرتا ہوں اور قیام میں لطف و لذت پاتا ہوں''۔ (فیصلہ ہفت مسئلہ ص ۵)

اذان میں اسمِ محمد ﷺ سن کر انگوٹھے چومنا:

اذان میں سرکارِ دوعالم ﷺ کا اسمِ گرامی سن کر اپنے دونوں انگوٹھے چوم کر آنکھوں سے لگانا جائز و مستحب اور باعثِ خیر و برکت ہے۔ اسکے جواز پر متعدد احادیث اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی رحمہ اللہ نے اپنی تصنیف ''منیر العین فی حکم تقبیل الابہامین'' میں نقل فرمائی ہیں جبکہ اس سے ممانعت پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

علامہ اسماعیل حقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، ''اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کے جمال کو حضرت آدم علیہ السلام کے دونوں انگوٹھوں کے ناخنوں میں مثلِ آئینہ ظاہر فرمایا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے انگوٹھوں کو چوم کر آنکھوں پر پھیرا، پس یہ سنت انکی اولاد میں جاری ہوئی''۔

امام ابوطالب محمد بن علی مکی رحمہ اللہ اپنی کتاب قوت القلوب میں ابن عیینہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے دس محرم کو مسجد میں تشریف لائے اور ستون کے قریب بیٹھ گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اذان میں آپ کا نام سن کر اپنے انگوٹھوں کے ناخنوں کو اپنی آنکھوں پر پھیرا، اور کہا، قُرَّةُ عَيْنِيْ بِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰه۔ ''یا رسول اللہ ﷺ! آپ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں''۔ جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان سے فارغ ہوئے تو آقا و مولیٰ ﷺ نے فرمایا، اے ابوبکر! جو تمہاری طرح میرا نام سن کر انگوٹھے آنکھوں پر پھیرے اور جو تم نے کہا وہ کہے، اللہ تعالیٰ اسکے تمام نئے پرانے، ظاہر و باطن گناہوں سے درگزر فرمائے گا۔ (تفسیر روح البیان ج ۴ ص ۶۴۸، ۶۴۹)

فقہ کی مشہور کتاب ردالمحتار جلد اول صفحہ ۳۷۰ پر ہے، ''مستحب ہے کہ اذان میں پہلی بار شہادت سن کر '' صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰه '' اور دوسری بار شہادت سن کر قُرَّةُ عَيْنِيْ بِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰه کہے، پھر اپنے انگوٹھے چوم کر اپنی آنکھوں پر پھیرے اور یہ کہے، اَللّٰهُمَّ مَتِّعْنِيْ بِالسَّمْعِ وَالْبَصَرِ تو حضور ﷺ اسے اپنے ساتھ جنت میں لے جائیں گے۔ ایسا ہی کنز العباد امام قہستانی میں اور اسی کی مثل فتاویٰ صوفیہ میں ہے''۔

حنفی علماء کے علاوہ شافعی علماء اور مالکی علماء نے بھی انگوٹھے چومنے کو مستحب قرار دیا ہے۔

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس بارے میں کوئی صحیح مرفوع حدیث نہیں ہے، سب احادیث ضعیف ہیں لہٰذا ضعیف حدیث دلیل نہیں بن سکتی۔ یہ اعتراض فنِ حدیث سے جہالت پر مبنی ہے۔ محدثین کا یہ فرمانا کہ ''یہ احادیث رسول کریم ﷺ تک مرفوع ہو کر صحیح نہیں'' یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ احادیث موقوف صحیح ہیں کیونکہ صحیح نہ ہونے سے ضعیف ہونا لازم نہیں آتا۔ انکے علاوہ بھی احادیث کے کئی درجے ہیں جن میں بدتر درجہ موضوع ہے جبکہ ''فضائلِ اعمال میں ضعیف حدیث بالاجماع مقبول ہے''۔ (مرقاۃ، اشعۃ اللمعات)

انگوٹھے چومنے سے متعلق حدیث موقوف صحیح ہے چنانچہ محدث علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، ''میں کہتا ہوں جب اس حدیث کا رفع حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک ثابت ہے تو عمل کے لیے کافی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے، میں تم پر لازم کرتا ہوں اپنی سنت اور اپنے خلفاء راشدین کی سنت''۔ (موضوعاتِ کبیر ص ۶۴)

گیارھویں شریف:

حضرت غوثِ اعظم پیرانِ پیر دستگیر سیدنا عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن کریم کی تلاوت، نعت خوانی، ذکرِ الٰہی اور تقسیم طعام و شیرینی پر مشتمل محفل جو عموماً کسی بھی دن اور خصوصاً چاند کی گیارہ تاریخ کو منعقد ہوتی ہے اسے گیارھویں شریف کہتے ہیں۔ اس کی اصل ایصالِ ثواب ہے جو کہ قرآن و سنت سے ثابت ہے۔

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ کھانے پینے کی چیزوں کی نسبت غیر خدا کی طرف کرنے سے وہ حرام ہو جاتی ہیں اسلیے گیارھویں شریف کا کھانا حرام ہے (معاذ اللہ)۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بارگاہِ نبوی میں عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! اُمِ سعد کا انتقال ہو گیا اب انکے ایصالِ ثواب کے لیے کون سا صدقہ بہتر ہے؟ ارشاد فرمایا، پانی۔ (کیونکہ اس وقت مدینہ طیبہ میں مسلمانوں کو پانی کی سخت حاجت تھی) لہٰذا آپ نے کنواں کھدوا کر فرمایا، هٰذِهٖ لِاُمِّ سَعْدٍ۔ یہ کنواں اُمِ سعد کے لیے ہے۔ (ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی شے کو کسی فوت شدہ ہستی کی طرف منسوب کرنا نہ تو گناہ ہے اور نہ ہی اس سے وہ شے حرام ہوتی ہے۔ جیسے حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کنوئیں کو اپنی والدہ کی طرف منسوب کیا، اسی طرح ہم گیارھویں شریف کو سرکار غوثِ اعظم رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، ''بیشک ہمارے شہروں میں سیدنا غوث اعظم کی گیارھویں شریف مشہور ہے اور یہی تاریخ اہلِ ہند میں سے آپ کی اولاد و مشائخ میں معروف ہے''۔ (مَا ثَبَتَ بِالسُّنَّة) عارفِ کامل شیخ عبدالوہاب متقی مکی قدس سرہ غوث الثقلین کا عرس کیا کرتے تھے۔ (ایضاً) شیخ امان اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ بھی ماہ ربیع

الآخر کی گیارہ تاریخ کو غوث الثقلین کا عرس کیا کرتے تھے۔ (اخبار الاخیار)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے مرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات اپنی کتاب کلماتِ طیبات میں جمع فرمائے ہیں، اسکا فارسی نسخہ مطبوعہ دہلی صفحہ ۷۷ ملاحظہ ہو، مرزا صاحب فرماتے ہیں، "میں نے خواب دیکھا کہ ایک وسیع چبوترہ پر بہت سے اولیاء کرام حلقہ کی صورت میں مراقبہ میں ہیں جن میں خواجہ نقشبند اور جنید بغدادی رحمہما اللہ بھی تشریف فرما ہیں۔ پھر یہ حضرات سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے استقبال کو چل دیے۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو انکے ساتھ چادر اوڑھے، برہنہ پاؤں ایک بزرگ بھی تھے جنکا ہاتھ تعظیم سے آپ نے اپنے ہاتھ میں لیا ہوا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ ہیں۔ پھر ایک صاف وشفاف حجرہ مبارک ظاہر ہوا جس پر نور کی بارش ہو رہی تھی، یہ تمام بزرگ اس میں داخل ہو گئے۔ میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آج حضرت غوث الثقلین کا عرس یعنی گیارھویں شریف ہے اور یہ تمام بزرگ اس عرس کی تقریب میں تشریف لے گئے ہیں"۔ سبحان اللہ! اس سے گیارھویں شریف کی فضیلت معلوم ہوئی۔

بعض لوگ کھانے پر فاتحہ پڑھنے کو ناجائز سمجھتے ہیں جبکہ کھانے پر کچھ پڑھنا اور دعائے برکت کرنا متعدد صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ آقا ومولیٰ ﷺ نے کھانا سامنے رکھ کر کچھ پڑھا اور دعا فرمائی۔ (بخاری، مسلم) ایک اور حدیث میں حضور ﷺ کا حلوہ پر دعائے برکت فرمانا مذکور ہے۔ (بخاری، مسلم) ارشادِ باری تعالیٰ ہوا، "تو کھاؤ اس میں سے جس پر اللہ کا نام لیا گیا اگر تم اس کی آیتیں مانتے ہو"۔ (الانعام: ۱۱۸) آپ بتائیے کہ فاتحہ میں کیا پڑھا جاتا ہے؟ کیا چاروں قل اور سورہ فاتحہ پڑھنے سے کھانا حرام ہو جاتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فاتحہ پڑھنے سے کھانا برکت والا ہو جاتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، "نیاز کا وہ کھانا جس کا ثواب امام حسن وامام حسین رضی اللہ عنہما کو پہنچایا جائے اور اس پر فاتحہ، قل اور درود شریف پڑھا جائے تو وہ کھانا برکت والا ہو جاتا ہے اور اسکا کھانا بہت اچھا ہے"۔ (فتاویٰ عزیزیہ ج اص ۷۱)

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ کھانے پر فاتحہ پڑھنا اور بزرگانِ دین کو ایصالِ ثواب کرنا جائز ومستحب ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ بندوں کا طریقہ اور صراطِ مستقیم ہے۔

تقلید محبوبانِ خدا کا راستہ ہے:

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارے لیے صراطِ مستقیم ضروری ہے اور صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرنے والے راہبر وامام بھی، یعنی ہمارے لیے کسی امام کی تقلید کرنی ضروری ہے۔ کسی فقیہ کے قول پر شرعی دلیل کے تحت عمل کرنا تقلید شرعی ہے جس کا فرض ہونا اس آیت کریمہ سے ثابت ہے۔ ارشاد ہوا،

"اور مسلمانوں سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سب کے سب نکلیں تو کیوں نہ ہو کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ حاصل کریں اور واپس آ کر اپنی قوم کو ڈر سنائیں اس امید پر کہ وہ بچیں"۔ (التوبۃ: ۱۲۲، کنز الایمان) اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر شخص پر عالم وفقیہ بننا ضروری نہیں لہٰذا غیر مجتہد یا غیر عالم کو مجتہد یا عالم کی تقلید کرنی چاہیے۔

صحابہ کرام براہِ راست نبی کریم ﷺ سے دین کا علم حاصل کیا کرتے تھے اسلیے انہیں کسی کی تقلید کی ضرورت نہیں تھی۔ آقا ومولیٰ ﷺ کے ظاہری وصال کے بعد صحابہ اور تابعین بھی اپنے درمیان موجود زیادہ صاحبِ علم صحابی کی تقلید کیا کرتے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرماتے تھے،

"جب تک یہ عالم تمہارے درمیان موجود ہیں، مجھ سے مسائل نہ پوچھا کرو"۔ (بخاری)

یہی تقلیدِ شخصی ہے جو دورِ صحابہ میں بھی موجود تھی۔ بخاری شریف میں حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اہلِ مدینہ نے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول پر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی تقلید کو ترجیح دی۔ اسی کا نام شخصی تقلید ہے۔

آقا ومولیٰ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم بنایا تو دریافت فرمایا، اگر تمہیں کوئی مسئلہ قرآن وسنت میں نہ ملے تو کیسے فیصلہ کرو گے؟ عرض کی، میں اجتہاد کروں گا۔ ارشاد فرمایا، "اللہ کا شکر ہے جس نے رسول کے قاصد کو اس بات کی توفیق دی جس سے اللہ تعالیٰ کا رسول راضی ہے"۔ (ترمذی، مشکوٰۃ)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رقمطراز ہیں، "صحابہ کرام سے مذاہبِ اربعہ کے ظہور تک لوگ بغیر انکار کیے کسی نہ کسی عالم کی ہمیشہ تقلید کرتے رہے، اگر یہ باطل ہوتا تو علماء ضرور انہیں منع کرتے"۔ مزید فرمایا، "جاننا چاہیے کہ چاروں مذاہب میں سے کسی ایک کی تقلید میں بڑی مصلحت ہے اور ان سے روگردانی میں بہت بڑا خسارہ ہے"۔ (عقد الجید)

تمام اکابر محدثین بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی، دارمی، طحاوی وغیرہ اور تمام مفسرین، فقہاء اور اولیاء کرام رحمہم اللہ کسی نہ کسی امام کے مقلد ہیں۔ امام بخاری، امام ابوداؤد اور امام نسائی کا مقلد ہونا تو خود غیر مقلد عالم نواب صدیق حسن بھوپالی نے "الحطہ" میں بیان کیا ہے۔ گویا تقلید محبوبانِ خدا کا راستہ اور صراطِ مستقیم ہے۔

جب ایسے جلیل القدر محدثین، مفسرین، فقہاء اور اولیاء کرام، ائمہ اربعہ میں سے کسی نہ کسی امام کے مقلد ہیں تو پھر چند کتابیں پڑھے ہوئے اگر خود کو تقلید سے بے نیاز سمجھیں تو کیا یہ گمراہی نہیں ہے؟ غیر مقلدوں کے پیشوا مولوی محمد حسین بٹالوی نے "اشاعت السنۃ" میں اس حقیقت کا اعتراف یوں کیا، "پچیس برس کے تجربے سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق کی تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ آخر کو اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں"۔

یہ بات آپ کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگی کہ جو شخص بھی امامِ اعظم کی تقلید نہیں کرتا وہ بہرحال کسی نہ کسی "مولوی صاحب" کی تقلید ضرور کرتا ہے تو کیا یہ بہتر نہیں کہ موجودہ پرفتن دور کے کسی مفاد پرست مولوی صاحب کی تقلید کرنے کی بجائے اُس جلیل القدر امام اعظم کی تقلید کی جائے جس نے صحابہ کرام علیہم الرضوان کے مبارک زمانہ میں آنکھ

کھولی اوران کی زیارت کی، اورجس کی عظمت پراکابرائمہ ومحدثین متفق ہیں۔

غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ:

ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔گذشتہ آیت میں صراط مستقیم کی پہچان یہ بیان ہوئی کہ وہ انعام یافتہ بندوں کا راستہ ہے اوراس آیت میں ان لوگوں کی خبر دی گئی ہے جو صراط مستقیم کو چھوڑ کر ٹیڑھے راستے پر چلے۔''مغضوب علیہم'' سے یہودی اور''ضالین'' سے عیسائی مراد ہیں البتہ عمومِ الفاظ کے اعتبار سے ہر دشمنِ اسلام پران کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔

اس دعا کا مقصد یہ ہے کہ الٰہی! ہمیں ان کے راستے سے بچا جن پر تیرا غضب ہوااور جو گمراہ ہوئے۔''اس میں ہدایت ہے کہ طالبِ حق کو دشمنانِ خدا سے اجتناب اوران کے راہ ورسم وضع اطوار سے پرہیز لازم ہے''۔(خزائن العرفان)

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

قرآن حکیم نے یہ تعلیم دی ہے کہ مومنوں کے لیے گمراہوں اور بدمذہبوں سے دور رہنا ضروری ہے۔اسلیے فرمایا گیا،''تم میں جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو وہ اُنہیں میں سے ہے''۔(المائدہ:۵۱) یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان کے دوست اوردشمن اسکی زندگی پراثر انداز ہوتے ہیں اسی لیے تکمیلِ ایمان کے لیے دوستی اوردشمنی کی بنیاد اللہ تعالیٰ اوررسول ﷺ کی محبت پر رکھنے کی تلقین کی گئی۔حدیثِ نبوی ہے،''جو اللہ تعالیٰ کے لیے محبت کرے اوراللہ تعالیٰ کے لیے عداوت کرے اوراللہ تعالیٰ ہی کے لیے دے اوراللہ تعالیٰ ہی کے لیے روکے،اس نے اپنا ایمان کامل کرلیا''۔(ابوداؤد)

ارشادِ باری تعالیٰ ہے،''تم نہ پاؤ گے ان لوگوں کو جو یقین رکھتے ہیں اللہ اور پچھلے دن پر کہ دوستی کریں ان سے جنہوں نے اللہ اوراسکے رسول سے مخالفت کی اگرچہ وہ انکے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبے والے ہوں''۔(المجادلہ:۲۲،کنزالایمان)

اس آیت مبارکہ سے بھی معلوم ہوا کہ بدمذہبوں اور گمراہوں سے عداوت رکھنا اوردُور رہنا ایمان کی علامت ہے۔یونہی اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں سے محبت رکھنا بھی ایمان کی نشانی ہے۔ایک صحابی نے عرض کی،یارسول اللہ ﷺ! اُس شخص کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں جو کچھ لوگوں سے محبت کرتا ہے لیکن اسکی اُن سے ملاقات نہ ہوسکی؟ ارشاد فرمایا،''وہ اُنہی کے ساتھ ہوگا جن سے محبت کرتا ہے''۔(بخاری،مسلم)

حضور ﷺ نے یہ دعا سکھائی کہ،''اے اللہ! میں تجھ سے تیری محبت مانگتا ہوں اوراسکی محبت بھی جو تجھے محبوب ہے،اوروہ عمل مانگتا ہوں جو مجھے تیری محبت تک پہنچا دے''۔(ترمذی)

جب سورہ فاتحہ پڑھی جائے تو اسکے بعد پڑھنے والے اور سننے والے دونوں کو آہستہ آمین کہنا سنت ہے۔اسکے معنی ہیں،الہٰی! جو دعا میں نے کی ہے اسے قبول فرما''۔

سورہ فاتحہ کی برکتیں:

جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔باب المعرفت،باب الذکر،باب الشکر،باب الرجاء،باب الخوف،باب الاخلاص،باب الدعاء،باب الاقتدا۔(تفسیر کبیر)

جب بندہ نماز میں قیام کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی ثناء بیان کرتا ہے تو اس پر جنت کا پہلا دروازہ باب المعرفت کھول دیا جاتا ہے اور جب وہ تسمیہ پڑھتا ہے تو ذکرِ الٰہی کی برکت سے باب الذکر بھی کھول دیا جاتا ہے۔اسکے بعد وہ الحمد لله رب العلمين کہہ کر شکر ادا کرتا ہے تو اسکے لیے باب الشکر بھی کھول دیا جاتا ہے۔

جب بندہ الرحمن الرحيم کہہ کر اسکی رحمت ومہربانی کی امید کرتا ہے تو اس پر باب الرجاء یعنی امید کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے اسکے بعد وہ مالك يوم الدين کہتا ہے اور جزا وسزا کے ذکر سے اسکے دل پر خوف طاری ہوتا ہے تو اسکے لیے باب الخوف کھول دیا جاتا ہے۔پھر وہ اياك نعبد واياك نستعين کہہ کر خلوصِ دل سے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور استعانت کا طالب ہوتا ہے تو اس پر باب الاخلاص بھی کھول دیا جاتا ہے۔

جب وہ اهدنا الصراط المستقيم کہہ کر راہِ ہدایت پر ثابت قدم رہنے کی دعا مانگتا ہے تو جنت کا ساتواں دروازہ باب الدعا بھی کھول دیا جاتا ہے اور جب وہ صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين کہتا ہے اور نیک بندوں کی رفاقت اور پیروی کا طالب ہوتا ہے تو اس پر جنت کا آٹھواں دروازہ باب الاقتدا بھی کھول دیا جاتا ہے اوراسے گمراہوں کے شر سے پناہ عطا کی جاتی ہے۔

اگر بندہ سورہ فاتحہ کی آیات کو جنت کے مذکورہ دروازوں سے متعلق سچی طلب کے ساتھ تلاوت کرے اور خلوصِ دل سے آمین کہے تو وہ ضرور اس سورت کی برکتوں کا مستحق ہوجاتا ہے۔اگر وہ سورہ فاتحہ کی روحانی تعلیمات کو اپنا کر صراطِ مستقیم پر گامزن رہے تو اسکا نفس فرمانبردار ہو کر نفسِ مطمئنہ قرار پاتا ہے اوروہ اس بشارتِ قرآنی کا مستحق ہوجاتا ہے،

''اے اطمینان والی جان! اپنے رب کی طرف واپس ہو،یوں کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی پھر میرے خاص بندوں میں داخل ہو اور میری جنت میں آ''۔

(الفجر:۲۷-۳۰،کنزالایمان)

☆☆☆☆